لہریں
شفیق الرحمٰن

لہریں

شفیق الرّحمٰن

مَیں اس کتاب کو بہ صد ذوق وشوق

اپنے نام

معنون کرتا ہوں

؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف

اور ــــــــ

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول
پھول کچھ مَیں نے چنے ہیں اپنے دامن کے لیے

وغیرہ وغیرہ ــــ

ترتیب

ریویو

اس مضمون کی ابتدا ہی غلط ہے۔ بھلا ریویو کا مطلب کیا ہُوا؟ عنوان ریویو بازی یا ریویو نویسی ہونا چاہیے تھا۔ ریویو زنی اور ریویو نگاری بھی اچھے نام تھے۔

ہم یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ریویو کرنے کو تنقید نگاری بھی کہا جاتا ہے اور ہم اس مضمون میں صرف اِن ریویوز کا ذکر کریں گے جو ادبی سلسلے میں ہوتے ہیں۔ انسانوں وغیرہ پر نہیں۔

ریویو زنی کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے ہمارے ادب میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہو گا کہ اس کے بغیر ادب میں ترقی ناممکن ہے۔ بھلا جب تک ادیبوں کو بُرا بھلا نہ کہا جائے وہ ادب کی خدمت خاک کریں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ادیب اور پڑھنے والوں دونوں کو

طرح طرح کے موقعے ملتے ہیں۔ مثلاً ادیبوں کو یہ سنہرا موقعہ ملتا ہے کہ وہ بیزار ہو کر لکھنا ہی چھوڑ دیں اور اپنا وقت کسی بہتر مشغلے میں صرف کریں۔ اور پڑھنے والوں کے لیے ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیّا ہو جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ریویو کر کے ایک اچھے خاصے ادبی پہلوان کو منٹوں میں چِت گرا دیتا ہے' پھر دوسرے کی طرف لپکتا ہے' تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ ہم بھی ایسے موقعوں پر بہت خوش ہوتے ہیں اور دیر تک خوش رہتے ہیں۔ اس کے بعد اس مصنّف کا ایک بھی مضمون نہیں پڑھتے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ نئے شکاری جو لکھنے کے لیے بے قرار ہیں' دوسروں پر ریویو پڑھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں اور ادیب بننے سے باز رہتے ہیں۔ اگر یوں نہ ہو تو بے شمار حضرات ادیب بن جائیں۔

ہم اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ریویو بازی کے لاتعداد فائدے ہیں۔

شروع شروع میں ہم نے اس سلسلے میں غور نہیں کیا تھا، لیکن ایک دفعہ ہمارے ایک ادیب دوست کو عجیب سانحہ پیش آیا جس نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔

ہمارے دوست ایک عرصے سے افسانہ نویس تھے۔ ایک روز انہیں دفعتہً خیال آیا کہ اگر وہ ایک کتاب چھپوا دیں تو دنیا میں انقلاب آجائے گا اور ادب کی بہت بڑی کمی پوری ہو جائے گی۔ انہوں نے ہم سے مشورہ لیا۔ ہم نے کہا

کہ ضرور چھپواؤ۔ چنانچہ خاصی محنت و مشقت کے بعد کتاب چھپی۔ ہم کتاب پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ کتاب اچھی تھی۔ ہمارے دوست بھی پھولے نہ سمائے۔

چند ماہ کے بعد ایک رسالے میں اس کتاب پر ریویو چھپا۔ ہم نے پڑھا۔ مدّتِ دراز کا ذکر ہے اس لیے ہم بھول گئے ہیں لیکن کہیں کہیں سے یاد ہے کچھ اس طرح تھا——

"ایک نومشق کی پہلی کوشش ہے۔ اس لیے ہم اسے معاف کرتے ہیں۔ ہمیں ساری کتاب میں ایک بھی افسانہ پسند نہیں آیا۔ ایک مرتبہ تو ہم سچ مچ سوچنے بیٹھ گئے کہ واقعی یہ تحریریں افسانے ہی ہیں کیا؟ لیکن حقیقت کے اظہار میں چونکہ نوجوان مصنّف کی دِل شکنی کا اندیشہ ہے اس لیے ہم یہ بات یہیں چھوڑتے ہیں۔ افسانوں کے پلاٹ نہایت فرسودہ ہیں اور سب کے سب غیر ملکی ادب سے چرائے ہوئے ہیں۔ افسانوں کے عنوان بے تُکے ہیں۔ زبان نہایت غلط ہے۔ تحریر میں روانی نام کو نہیں۔ کتاب کے دیباچے میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ دیباچے کا نہ سَر ہے نہ پَیر۔ کتابت نہایت بُری ہے۔ کاغذ گھٹیا اور چھپائی بے حد ردّی۔ مصنّف نے اپنی تصویر کیوں نہیں شامل کی؟ خیر چونکہ اس کی پہلی کوشش ہے اس لیے ہم اس کی دل شکنی ہرگز نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے ایک بھی افسانے میں جان نہیں۔ کتاب کی جلد بھی اچھی طرح نہیں باندھی گئی۔ ٹائٹیل تو اس قدر واہیات ہے کہ دیکھ کر ہمیں سخت

غصّہ آیا لیکن پھر ہم نے سوچا کہ پہلی کتاب ہے جانے دو۔ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے اور بہت زیادہ تعداد میں چھاپ لی گئی ہے۔ ایک ہزار تو ایک طرف اگر اس کتاب کی دس پندرہ کاپیاں بھی فروخت ہو جائیں تو ہمارا نام بدل دینا۔ لیکن مصنف نوعمر ہے اور یہ اس کی پہلی کتاب ہے، اس لیے ہم اس کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اسے مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ کیا ہی اچھا ہو جو وہ صبر کر لے اور آئندہ کسی اور کتاب کے چھپوانے کی تکلیف نہ کرے، لیکن مصنّف کی چونکہ یہ پہلی کوشش ہے اس لیے ہم —— وغیرہ وغیرہ۔

یہ ریویو پڑھ کر ہمیں بڑا صدمہ ہوا۔ ہمارے دوست نے ریویو زن صاحب کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مضمون نویسی سے توبہ کر لی۔ آج کل وہ پولیس میں افسر ہیں۔

بات آئی گئی ہوئی لیکن ہمارے دل پر ریویو نویسوں کا سخت رعب بیٹھ گیا اور ہمیں دنیا بھر کے ادیبوں سے نہ جانے کیوں ہمدردی ہو گئی۔

ایک دن ہمارا تعارف ایک ریویو باز حضرت سے کرایا گیا جو ریویو کرنے کے لیے دُور دُور تک مشہور تھے۔ پوچھیے مت ہمارا کیا حال ہوا اس وقت۔ لیکن ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب وہ صاحب ہفتہ بھر میں ہمارے

دوست بن گئے۔ وہ سچ مچ ایک نارمل انسان تھے۔ پہلے تو ہم ہچکچاتے رہے۔ آخر ایک دن ہم نے ڈرتے ڈرتے ریویوزنی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کی تعریفیں بھی کیں کہ ایسے اچھے ریویو کر لیتے ہیں۔ اپنی کمزوریاں ظاہر کیں کہ جب کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو طربیہ حصّے پر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں اور حُزنیہ حصّے پر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ہمیں ہر کتاب پسند آجاتی ہے۔ اور ہمارا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ کسی پر ریویو نہیں کر سکتا۔ اس پر وہ حضرت بڑے زور سے ہنسے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔ جب ہنس چکے تو رونے لگے۔ بالکل الف لیلہ کے اس شہزادے کی طرح جو پرستان میں کسی دیو یا شاید کسی پری کو دیکھ کر ہنسا تھا پھر رو پڑا تھا۔ وجہ پوچھی تو بولے تمہاری جہالت پر رونا آرہا ہے۔ تمہاری بے خبری پر رو رہا ہوں۔

بڑی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ آخر انہوں نے ایک سوال کیا۔

"کیا تم بھی ریویو باز بننا چاہتے ہو؟"

ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ کہاں ریویو بازی اور کہاں ہم! ہم نے سر جھکا لیا اور شرما کر رہ گئے لیکن انہوں نے کچھ ایسی حوصلہ افزا باتیں کیں کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ریویو کرنا بہت آسان کام ہے۔

"لیکن آپ کو مطالعہ بہت کرنا پڑتا ہو گا؟" ہم نے پوچھا۔

"مطالعہ؟ — کیسا مطالعہ؟ — اور کیوں مطالعہ؟"

"آپ پہلے ایک کتاب کو کئی مرتبہ پڑھتے ہوں گے تب جا کر کہیں ریویو کرتے ہوں گے۔ نہایت وسیع مطالعہ ہو گا آپ کا۔"

"لاحول ولا قوۃ! اگر مطالعہ کر کے ریویو کرنے لگے تو ہو چکے ریویو ــــ مطالعہ کون مسخرہ کرتا ہے۔"

"ہیں! تو کیا سچ مچ ــ!"

"ہاں! سچ مچ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔ اگر ذرا سی مشق ہو جائے تو کتاب کو دیکھ کر یا سونگھ کر ریویو کے صفحے کے صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ ہمارے استاد بن گئے اور ہم ان کے شاگرد۔ انہوں نے ہمیں یہ فن سکھانا شروع کیا۔ محض چند ہفتوں کی تعلیم کے بعد ہم نے بھی ریویو بازی شروع کر دی۔ سب سے پہلا ریویو ہم نے ایک دیوان پر کیا (دیوان وہ کتاب ہوتی ہے جس میں شعر ہی شعر ہوتے ہیں)۔ یہاں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے ایک بھی شعر نہیں کہا اور نہ فی الحال کوئی ارادہ ہے۔ اور نہ ہمیں شعروں کی کوئی پہچان ہے۔ پھر بھی ہم نے ریویو کر دیا اور وہ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس ریویو کے لیے دھڑا دھڑ کتابیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ ریویو کچھ اس طرح تھا ــــ

"موجودہ شاعری آج کل جس دشوار اور کٹھن منزل سے گزر رہی ہے اس کا بیان ہماری طاقت سے باہر ہے۔ یہ دشوار و پُرخطر راستہ جس میں جگہ جگہ

رکاوٹیں ہیں، نہایت بیہودہ راستہ ہے۔ ہمارے خیال میں موجودہ شاعری کو کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ خیر، اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

اب مثال کے طور پر شاعرِ موصوف کے دیوانِ مذکور میں سے ایک نظم پیش کرتے ہیں۔ اس میں شاعر نے ایک نہایت مشکل مضمون کو بڑی خوبی سے نباہا ہے۔ پُرانی شاعری میں اس خیال کو ہرگز نہیں بیان کیا جا سکتا تھا لیکن جدید شاعری نے ہمارے لیے نئی راہیں کھول دی ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو:

لڑ رہی ہیں بلّیاں!
اُف بلّیاں

بِل

لیاں

باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلّیاں!
دُھندلکا ہے شام کا
وقت ہے آرام کا

کام کا

انعام

کا

اور لڑ رہی ہیں بلّیاں!

ہوں گی شاید چار یہ

یا تین ہوں

لیکن ذرا سا یہ شبہ دل میں ہے میرے بڑھ گیا کہ بلّیاں یہ پانچ ہیں۔

اور چھ تو ہو سکتی نہیں !

اور چاندنی سی رات ہے

اور چاند ہے نکلا ہُوا

اور چاندنی ہے چار سُو

اور چار دن کی چاندنی

اور پھر اندھیری رات ہے !

کیا کہہ رہا تھا مَیں بھلا

اوہ ! ابھی تو یاد تھا

اس حافظے کو کیا ہوا

کم بخت سے سمجھے خدا

ہاں مجھ کو یاد آ ہی گیا

کہ لڑ رہی ہیں بلّیاں !

باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلّیاں !

کیا بات ہے، سبحان اللہ! جزاک اللہ! مرحبا! دیکھا آپ نے؟ اگر نہیں دیکھا

تو پھر دیکھیے۔ مزاح و متانت کا امتزاج، رومان و حقیقت کا عجیب و غریب اتصال شاعر نے کیا ہلکی پھلکی اور دُبلی پتلی نظم کہی ہے!

بلّیوں پر آپ نے آج تک کوئی نظم پڑھی؟ غالباً نہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو بلّیوں سے بے حد عقیدت ہے اور ہونی بھی چاہیے۔

ذرا تصویر بنائیے۔ چاندنی رات، باغ کا ایک تنہا گوشہ، شاعر کا بے چین دل اور کہیں دُور سے بلّیوں کے لڑنے کی آواز۔ اُف خدایا! کیا کوئی اور چیز اس سے زیادہ رومان انگیز ہو سکتی ہے؟ شاعر کو یہ بھی یقین نہیں کہ یہ بلّیاں ہی ہیں! اس نے لفظ شاید کو استعمال کر کے نظم کو نامعلوم بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت باغ میں کتّے ہی بھونک رہے ہوں لیکن شاعر کو بلّیاں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ پھر شاعر یہ بھی نہیں جانتا کہ ان بلیوں کی تعداد کیا ہے۔ کتنی مزیدار بات ہے لیکن اسے یہ یقین ضرور ہے کہ چھ سے کم ہیں۔ چاندنی میں شاعر کو اندھیری راتیں یاد آتی ہیں۔ جب باغ میں اندھیرا ہوگا اور بلّیاں بھی نہیں لڑیں گی۔ بے ثباتیِ عالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ لیکن انتہائی کمال شاعر نے وہاں دکھایا ہے جہاں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہاں وہ اپنے حافظے کو کوستا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ ایسے وقت اپنے حافظے کو کوستے ہیں۔ یہاں ہم حقیقت نگاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اسی سلسلے میں ہم ایک اور شاعر کی غزل پیش کرتے ہیں (یہ ہم اپنی طرف

سے کر رہے ہیں، پرانی شاعری میں بندشیں بہت تھیں اور ہم جذبات کا اظہار کرتے وقت گھُٹ کر رہ جاتے تھے لیکن جدید شاعری میں بڑی وسعت ہے یہاں تک کہ جو کچھ ہم بولتے ہیں اسے براہِ راست شعروں میں منتقل کیا جاسکتا ہے مثلاً "اماں ٹھہرو بھی سہی" یا "ارے ارے" اور "اول ہول" کو بھی قافیہ یا ردیف رکھ سکتے ہیں۔

اب ہم اپنے محترم دوست آزہر صاحب کی ایک غزل پیش کرتے ہیں ہم نے جہاں چ چ لکھا ہے اُسے آپ چ چ پڑھیے جو اظہارِ افسوس پر منہ سے نکل جاتا ہے۔

قصۂ قلبِ ناتواں چ چ ۔۔۔ دُکھ بھری ہے یہ داستاں چ چ
ہر حسیں شکل پر خود آجانا ۔۔۔ خود ہی پھر نالہ و فغاں چ چ
تیر کھانا ہر اک کی نظروں کے ۔۔۔ اور دینا دہائیاں چ چ
فصلِ گُل میں غمِ آشیانے کا ۔۔۔ گلۂ آمدِ خزاں چ چ
درِ جاناں پہ خود ہی جاجا کے ۔۔۔ کھانا درباں کی گالیاں چ چ
اِک تو یہ دل کی بے تُکی باتیں ۔۔۔ اس پہ تخیلِ شاعراں چ چ
الغرض شیخ جی محبّت کی ۔۔۔ ہے کچھ ایسی ہی داستان چ چ

کیا کوئی ایسی غزل آج سے پچاس سال پہلے کہہ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں یہاں ہمیں دو شعر اور یاد آ گئے۔

جگر کی چوٹ اُوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اُوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

لفظ "نہیں" نے شعر کو چار چاند لگا دیے۔ کیا معصومیت پیدا ہو گئی۔ سبحان اللہ!

دوسرا شعر ہے۔

کہیں کرتا ہے کوئی یوں جفائیں نازنیں ہو کر
نہیں کرتا ہے کوئی یوں جفائیں نازنیں ہو کر

——— وغیرہ وغیرہ ———

غرض یہ کہ اس قسم کا ریویو ہم نے کیا تھا۔ ریویو کوئی پچاس صفحات کا ہو گا۔ اور وہ دیوان کل چالیس صفحے کا تھا۔ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ بس۔ اسے موجودہ دَور کا بہترین ریویو قرار دیا گیا اور ہمارا نام ہر جگہ مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے جو ریویو کرنے شروع کیے ہیں تو ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ کتابیں بھگتا دیں۔ کتاب کو دو تین منٹ پڑھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو سُونگھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو دور سے دیکھا اور ریویو کر دیا۔ ایک پر تو ہم نے بغیر دیکھے ریویو کر دیا جو حسبِ معمول بے حد مقبول ہُوا۔

لیکن ہمیں وہ سانحہ یاد تھا جو ہمارے پرانے دوست پر گزرا تھا، چنانچہ ہم

اُن سے ملے اور کہا اب ایک کتاب لکھیے پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے۔ میں ایسا ریویو کر دوں گا کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ انہوں نے معذرت کی اور بولے مجھے اب نہ کتابیں لکھنے کی فرصت ہے نہ پڑھنے کی۔ ہم نے پوچھا آپ کا کوئی دوست کتاب لکھ رہا ہو، لکھ چکا ہو یا لکھنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ہمیں بتا دیجیے۔ وہ بولے میں دریافت کروں گا۔ انہوں نے جب دوستوں سے پوچھا تو سب نے معذرت کی لیکن وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوستوں سے پوچھیں گے۔ اور جب انہوں نے اپنے دوستوں سے پوچھا تو وہ بھی معذرت کر گئے۔ غرضیکہ اسی طرح یہ پیغام دُور دُور تک پہنچ گیا۔ آخر ایک صاحب ہم سے ملنے آئے جو ہمارے دوست کے دوست کے دوست کے دوست تھے۔ انہوں نے ازراہِ کرم ہمیں اس دکان کا پتا بتایا جہاں سے ہم ان کی کتاب خرید کر اس پر ریویو کر سکتے تھے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ چلتے وقت وہ بولے "ذرا خیال رکھیے گا" ہم نے مسکرا کر کہا "آپ بے فکر رہیے۔"

ہم نے شام کو کتاب خریدی اور علی الصبح ریویو لکھ کر پریس میں بھیج دیا۔ وہ ریویو کچھ ایسا مقبول ہوا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔

(اس ریویو کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔ کچھ حصہ اس لیے کہ ہمارے ریویو بیحد طویل ہوتے ہیں)۔

"یہ اور وہ" حضرت آبِ تربوزی کے دو افسانوں کا مجموعہ۔ لکھائی دیدہ زیب چھپائی زرق برق۔ کاغذ سفید اور چکنا۔ دیباچہ از حضرت بدنصیب مجذوبی۔ مصنّف کی تین تصویریں شامل ہیں۔ ضخامت ۲۸ صفحے۔ قیمت صرف پونے چار روپے جو زیادہ نہیں۔

مصنّف نے صرف دو افسانے لکھ کر اردو ادب میں ایسا نام پیدا کیا ہے جو کوئی اور ادیب دو افسانے لکھ کر ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ اِن گنے گنائے صفحات میں زندگی کی وہ تفسیریں پیش کی گئی ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کرنے لگتا ہے۔ حسن و عشق کی گھاتیں، چوری چوری کی ملاقاتیں، نفرت و عداوت کے قصے، دیوانی اور فوجداری کے قضیے، زمین کاشت کرنے کے نئے نئے طریقے، جانوروں اور پرندوں کے متعلق دلچسپ باتیں، کھانوں کی ترکیبیں، کیا ہے جو اس کتاب میں نہیں۔

پہلے افسانے میں جہاں ہیرو اور ہیروئن اونٹ پر سوار ہو کر بھاگ جاتے ہیں وہاں مصنّف کی حسّاس طبیعت اور تیز نگاہیں اُونٹ کو نظر انداز نہیں کر دیتیں۔ مصنّف اونٹ کے متعلق لکھتا ہے: ——

" اُونٹ ایک مستطیل نما جانور ہے جس کا ہر کونا زاویہ قائمہ ہے۔ اونٹ کی گردن اس کے دھڑ سے پینتالیس درجے کا زاویہ بناتی ہوئی دفعتہً جسم سے مل جاتی ہے اور لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اونٹ کی پیٹھ پر ایک ابھری ہوئی نوک دار چیز ہوتی ہے جسے کوہان کہتے ہیں۔ یہ اونٹ کو دو حصّوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اونٹِ خورد اور اونٹِ کلاں۔

اونٹ کی گردن اس لیے لمبی ہے کہ اس کا سر اس کے جسم سے خاصا دُور ہے۔ اونٹ ایک شریف الطبع، شریف النفس، مخبوط الحواس اور مہمان نواز جانور ہے۔ اس کا ذکر دنیا کی ہر مذہبی کتاب میں موجود ہے۔

اونٹ کو عربی میں شتر اور انگریزی میں کیمل کہتے ہیں۔ پنجاب میں ایک شہر کیمل پور بھی ہے۔

اونٹ کی طبیعت میں انکسار پایا جاتا ہے۔ وہ مغرور بالکل نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس مغرور ہونے کی کوئی چیز ہی نہیں۔

"اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" غلط کہاوت ہے۔ یہ اونٹ پر تہمت ہے، سراسر بہتان ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پانی پیتے وقت اونٹ کی گردن بالکل سیدھی ہو جاتی ہے اور خطِ مستقیم بناتی ہے۔ اونٹ ہفتوں تک ناشتہ کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ اسے صحرائی جہاز کا خطاب دیا گیا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جب وہ دُور سے اونٹ کو دیکھتے ہیں تو انہیں جہاز یاد آ جاتا ہے؛ لیکن جہاز کو دیکھ کر انہیں کیا یاد آتا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اونٹ جب چھوٹا ہوتا ہے تو بھی تقریباً اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنا ایک بڑا اونٹ۔

اس کی سواری سے صحت بہت اچھی رہتی ہے۔ ورزش کی ورزش ہو جاتی ہے اور سوار سمندر کی سطح سے خاصا بلند رہتا ہے۔ اونٹ کی چال بڑی متوالی ہوتی ہے، چنانچہ ایک گوّیے نے اونٹ کو چلتے دیکھ کر اپنا مشہور راگ "رم جھم رم جھم چال تمہاری" گایا تھا اور اُونٹ نے سُنا بھی نہیں۔

اونٹ کبھی کبھی صحرا میں ناچتا بھی ہے لیکن اکیلے ہی اکیلے ــــ جنگل میں اونٹ ناچا کس نے دیکھا۔

اونٹ کو ایک دُم عطا ہوئی ہے۔ نصف جس کے نصف دُم ہوتی ہے۔ لیکن دُم کی اہمیت اس قدر اہم نہیں کیونکہ بغیر دُم کے اونٹ بھی پائے جاتے ہیں۔ زرد رنگ کا اونٹ زرد ہوتا ہے اور بھورا اونٹ بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔

اونٹ پر دنیا کے مشہور ترین شعرائے شعر کہے ہیں۔ ایرانی ادب میں اونٹ اور بلبل دونوں کا ذکر ہے۔

ہندوستان میں بھی اونٹ نواز شاعر گزرے ہیں۔ ایک شعر ہے۔

اونٹ ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

ایک اور شعر ہے۔

گیا ہے اونٹ کوئی اس طرف سے
پتا دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

ایک گیت ہے۔

اے اونٹ کہیں لے چل

اور لطف یہ ہے کہ ایک مکمل اونٹ بننے میں فقط تین سال لگتے ہیں۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ حقیقت نگاری کی حد ہو گئی۔

مصنف کی نگاہیں کہاں کہاں جا پہنچتی ہیں۔ کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ پھر ایک جگہ مصنف نے شادی کا نازک مسئلہ اس خوبی سے بیان کیا ہے

کہ ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہاں ہمیں ایک کہانی یاد آگئی۔ کسی نے سقراط سے پوچھا۔ ٹھہریے شاید بقراط سے پوچھا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ جالینوس یا فیثاغورس ہی سے پوچھ لیا ہو۔ بہر حال اسی قسم کے ایک پرانے عقلمند سے کسی نے پوچھا کہ جناب! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مشورہ دیجیے کہ کر بیٹھوں یا کنوارا رہوں؟ جواب ملا کہ برخوردار شادی کرو گے تو بھی پچھتاؤ گے اور جو کنوارے رہو گے تو بھی پچھتاؤ گے۔

پھر ایک چینی عالم (چینی کے عالم آپ کہیں برتن ورتن نہ سمجھ لیں) ہشت ہشت سے اس کے شاگرد چونگ چینگ چانگ نے پوچھا کہ اے استاد کیا یہ سچ ہے کہ شادی شدہ حضرات کنواروں سے زیادہ دیر زندہ رہتے ہیں اور ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں؟ استاد نے فوراً جواب دیا — اے پیارے شاگرد! وہ اصل میں طویل نہیں ہوتیں بلکہ انہیں محسوس ہوتی ہیں کہ بے حد طویل ہیں۔

اسی طرح مشہور چینی سیّاح چیاؤں میاؤں ہینگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ شادی شدہ انسان درحقیقت نصف انسان ہوتا ہے۔

پھر مصنّف نے ہمارے سماج کا مذاق اڑایا ہے۔ ہماری معاشرت پر وہ خوب ہنسا ہے۔ ہمارے تعلیمی معیار پر وہ لکھتا ہے: "ہمیں امتحان میں پاس ہونے کے لیے ۳۳ فیصد نمبر درکار ہیں۔ یعنی اگر تین سوالوں میں سے ایک کا

جواب صحیح ہو تو ہم معیار پر پُورے اُترتے ہیں اور کامیاب قرار دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک اُلّو بٹھا دیا جائے اور پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہہ دیں کہ یہ خرگوش ہے تو ہمیں دوبارہ سوچنے کو کہا جاتا ہے۔ پھر ہم کہہ دیں کہ یہ قُمری ہے۔ ہمیں ایک اور موقع ملتا ہے اور اگر تیسری مرتبہ ہم کہہ دیں کہ یہ کچھ اُلّو نما پرندہ ہے جس کی ہر بات سے اُلّو پن ٹپکتا ہے، تو ہم پاس ہو جاتے۔ اب اس فی صد کو ہی لے لیجیے۔ ہر روز پڑھتے ہیں کہ یہاں دس فیصد آدمی کمزور ہیں۔ اس کلاس میں پندرہ فی صد بچّے بیمار رہتے ہیں۔ اچھا اب فرض کیجیے کہ ایک مکان میں دس آدمی رہتے ہیں اور ان میں اتفاق سے ایک کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اگر آس پاس کوئی ریاضی داں ہوئے تو حساب لگا کر فوراً کہہ دیں گے کہ اس مکان میں باقی جو نو آدمی ہیں اُن میں سے ہر ایک کا دس فی صد انتقال ہو چکا ہے اور جس غریب کا انتقال ہُوا ہے وہ نوّے فی صد تندرست ہے۔ خیر، یہ تو کچھ بھی نہیں، سب سے عجیب و غریب چیز اکائی کا قاعدہ ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک اڑھائی فٹ لمبا کتّا جس کی دُم ڈیڑھ فٹ لمبی ہے سارے دن میں اپنے پنجوں سے چھ مربع فٹ زمین کھود ڈالتا ہے۔ تو ایک پندرہ میل لمبا کتّا جس کی دُم نو میل لمبی ہو، ایک نئی نہر سویز کو دو سال ایک مہینا دو دن اور پونے چار گھنٹے میں کھود دے گا۔"

مصنّف کا مطالعہ بیحد وسیع ہے۔ باتوں باتوں میں وہ دُور دُور تک پہنچ

جاتا ہے۔ پھر فوراً واپس آجاتا ہے۔ جہاں ہیروئن ہیرو کے انتظار میں گاجریں کھا رہی ہے، وہاں وہ گاجروں کے متعلق لکھتا ہے :

"گاجروں کو اچھی طرح نہیں توڑا جاتا۔ تبھی گاجروں کی ایک بہت بڑی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں گاجریں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر حالات اسی طرح رہے تو وہ دن دُور نہیں جب ہم گاجروں کو ترسیں گے۔ گاجروں کو توڑنے کا بہترین وقت ہے جب وہ نہ بہت کچّی ہوں نہ بہت پکّی۔ نہ بہت ملائم ہوں نہ بہت سخت۔ نہ بہت میٹھی ہوں نہ بہت پھیکی۔

گاجریں توڑنے والے گاجروں کے درخت پر چڑھ جائیں۔ ایک لمبے سے رسّے کی مدد سے وہ بآسانی چڑھ سکتے ہیں۔ ویسے احتیاط کرنا چاہیے کیونکہ گاجروں کا درخت کافی چکنا ہوتا ہے اور پھسلنے کا ڈر رہتا ہے۔ نیچے زمین پہ چادریں بچھا دی جائیں اور درخت کی ٹہنیاں خوب زور سے ہلائی جائیں گاجریں نیچے چادروں پر جا گریں گی۔"

ذرا سوچیے تو سہی کہ رومانی افسانوں میں ایسی مفید باتیں کون بتاتا ہے۔ یہ کسی کسی کا کام ہے۔

مصنّف نے نئے نئے الفاظ اختراع کیے ہیں جو یقیناً بہت جلد ہمارے ادب میں عام ہو جائیں گے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں :

چہاس : پیاس کے وزن پر چہاس بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پیاس

پانی کی ہوتی ہے اور پیاس چائے کی۔ مثلاً کوئی سہ پہر کو کہے بھئی مجھے سخت پیاس لگی ہے۔

پوشیدہ غنچی : یعنی چھپ کلی۔ چھپکلی ویسے بھی غیر مانوس سا نام تھا۔

دستی : ہاتھی۔ ہاتھی غیر رومانی چیز معلوم ہوتی تھی۔

قمریا : چندیا۔ یہ کہنا کہ اس کی چندیا پر ایک بھی بال نہیں، کتنا غیر رومانی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جگہ یہ کہ اس کی قمریا پر ایک بھی بال نہیں، کس قدر بہتر ہے۔

اب ہم چند رومانی سین پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے کمال چابکدستی سے یہ سین پیش کیے ہیں۔ دوسرے افسانے کا ایک مختصر سا حصہ ہم نقل کرتے ہیں:

"ایک نہایت خوش نما باغ میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ باغ میں ایک بھی پھول نہیں تھا۔ پھر بھی نہ جانے خوشبو کہاں سے آرہی تھی۔ وہاں بہت سی سڑکیں تھیں۔ ہر سڑک ساڑھے دس فٹ چوڑی اور سو فٹ لمبی تھی۔ سو فٹ کے بعد وہ فوراً ایک اور سڑک سے مل جاتی۔ اس طرح سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر سڑک پر دو رویہ درخت کھڑے جھوم رہے تھے۔ ایک ایک لائن میں چالیس چالیس درخت تھے۔ ہر درخت کی پچاس پچاس ٹہنیاں اور ہر ٹہنی پر پانچ پانچ پرندے بیٹھے گا رہے تھے۔ سارے باغ کے پرندے ایک وقت ایک سُر گاتے تھے۔ ہر سات منٹ کے بعد سُر تبدیل ہو جاتی تھی۔"

یہ پڑھ کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ مصنف

لکھتا ہے۔" ہیروئن نے بڑے پیار سے پوچھا " میں ایک ماہ سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی جرابیں مختلف رنگ کی ہوتی ہیں۔ آپ ہر روز ایک پاؤں میں سرخ جراب پہن کر آتے ہیں اور دوسرے میں سبز۔"

ہیرو نے ایک گھٹنے پر جھک کر اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھا اور نہایت دردناک لہجے میں بولا: " میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ یہ دو مختلف جرابیں نہیں بلکہ جرابوں کا ایک جوڑا ہے۔"

ہیروئن نے شرما کر کہا۔" بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

" بالکل ایسا ہی ایک اور جوڑا ہمارے گھر میں پڑا ہوا ہے۔"

بس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں لکھیں گے۔ باقی آپ کتاب میں پڑھیے۔ ہم اس فقرے پر اپنا ریویو ختم کرتے ہیں کہ ہمارے ادب میں ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔

خیر، ریویو تو بے حد مقبول ہُوا لیکن ساتھ ہی لوگوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ہمیشہ ریویو میں تعریفیں ہی کرتے ہیں اور مصنّف کو اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم ہر کتاب پر ریویو لکھ مارتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز ہمیں ایک خط ملا جس میں ایک صاحب نے بڑی بے نیازی سے ہمیں لکھا تھا کہ اپنی کتاب کی تین کاپیاں بذریعہ وی پی بھیج رہا ہوں۔ ان میں سے ایک پر ریویو کر دیجیے۔ اگلے ہفتے تک ریویو چھپ جانا چاہیے۔ مجھے بہت جلدی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ آپ کو دس دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔ جن جن پرچوں میں آپ ریویو چھپوائیں ہر ایک کی ایک ایک کاپی مجھے بھیجیں۔"

یہ خط ہمیں بُرا ضرور معلوم ہوا لیکن ہم چپ رہے۔ وی۔ پی ملا۔ ہم نے وصول کر لیا۔ کھول کر جو دیکھتے ہیں تو اندر نہ جانے کیا کیا الا بلا نکلی۔ بینائی بخش سُرمہ، قوت بخش حلوا، فرحت بخش شربت۔ کسی مولا بخش، خدا بخش اینڈ سنز اینڈ ڈاٹرز نے ہمیں بھیجا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ مصنّف صاحب کو خط لکھا۔ جواب ملا کہ "آپ کے نام تیس گز ریشم وی پی کرا رہا ہوں۔ اسی پارسل میں میری کتاب بھی ہو گی۔" دل پر جبر کر کے ہم نے وہ پارسل بھی وصول کر لیا۔ اس میں کتاب نہ ملی۔ جھنجلا کر پھر ایک خط لکھا۔ جواب آیا "معاف کیجیے گا۔ کارخانے والوں سے پیکنگ میں غلطی ہوئی۔ مجھے اندازہ ہے آپ کتاب کے لیے کس قدر بے چین ہوں گے۔ ریویو کرنے والے بعض اوقات تو انتظار کرنے سے پہلے ہی بے صبر ہو جاتے ہیں۔ اور آپ نے واقعی خاصا انتظار کیا ہے۔ اب کل آپ کے نام پندرہ جوڑے جوتے، گھوڑے کی زین اور اونٹ کے دو کجاوے وی پی کرا رہا ہوں۔

اس پارسل میں کتاب ضرور ہو گی۔"

ہمیں بے حد غصہ آیا۔ ہم نے فوراً بازار سے ان کی کتاب خریدی اور ساری رات کتاب پر ضائع کر دی۔ دوسرے روز مندرجہ ذیل ریویو پریس میں بھیج دیا۔

سلطانہ اور دیگر افسانے ——— از حضرت شتر بے مہاری۔ کاغذ کھردرا، لکھائی بے کار، چھپائی اور بھی بے کار، گٹ اپ سرے سے غائب۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس کتاب کا نام بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نام سے فوراً سلطانہ ڈاکو یاد آجاتا ہے۔ کتاب میں تیرہ افسانے ہیں۔ تیرہ کا عدد نہایت منحوس ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے افسانوں پر نحوست برس رہی ہے۔

صفحات کی تعداد چار سو بیس ۴۲۰ ہے جو نہایت خطرناک ہندسہ ہے۔ کاغذ نہ صرف کھردرا ہے بلکہ ردّی میں خریدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اڑھائی روپے قیمت بہت زیادہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو اس مجموعے کی قیمت آٹھ دس آنے کافی تھی۔

یہ مجموعہ قلندر علی، قلندر علی اینڈ قلندر علی نے چھاپا ہے جو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انہیں لوگ اکثر پسند نہیں کرتے۔ اس کارخانے کے مالک کا بڑا لڑکا اس وقت جیل میں ہے اور چھوٹا لڑکا اس قدر جواری ہے کہ کیا کہا جائے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ———

اوہ معاف کیجیے۔ ہاں! تو کتاب کا ٹائیٹل ایک فلمی سین کا چربہ ہے۔

یہ سین فلم رباعیاتِ علی بابا سے لیا گیا ہے ــــ جہاں مِس طوطا مینا، ماسٹر پہلوان کا انتظار کر رہی ہیں۔ ویسے یہاں مِس طوطا مینا کو بے حد موٹا دکھایا گیا ہے۔ کاش کہ مِس موصوفہ اُسے دیکھیں اور قلندر حضرات پر دعویٰ کر دیں تاکہ ان کی ساری مستی اور قلندری کافور ہو جائے۔ مصنّف نے اپنی تصویر بھی شامل کی ہے کاش کہ وہ کسی عقلمند سے مشورہ کرتے تاکہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔ تصویر میں بے شمار خامیاں ہیں۔ مصنّف کا ایک کان بڑا ہے اور دوسرا برابر ہے۔ یا یوں کہ ایک کان اوسط ہے اور وہ اس کان سے چھوٹا ہے جو بڑا ہے۔ اور وہ بڑا کان اِس چھوٹے کان کے مقابلے میں محض اس لیے بڑا دکھائی دیتا ہے کہ چھوٹا کان باوجود اوسط درجے کا ہونے کے اس کان سے جو ــــ معاف کیجیے۔ تصویر دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ مصنّف نے کئی دنوں سے حجامت نہیں بنوائی۔ اس کی ٹائی کی گرہ غلط ہے۔ اس کے سوٹ میں بے شمار سلوٹیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج تک اِستری نہیں کیا گیا۔ یا کسی گھڑے میں سے نکالا گیا ہے۔ مصنّف نے ٹائی، کالر بٹن کے بغیر ہی لگائی ہے۔ ہمارے دل میں شبہہ سا پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں یہ سوٹ کسی اور کا تو نہیں۔

دیباچہ ہے تو سہی لیکن دیباچہ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا گیا۔ اس لیے ہمارا اندازہ ہے کہ دیباچہ خود مصنّف ہی نے دُھر گھسیٹا ہے۔ اس میں نہ مصنّف کے متعلق کچھ لکھا ہے نہ اس کی تحریروں کے متعلق۔ محض اِدھر اُدھر کی باتیں

لکھی ہیں۔

اب رہی کتابت، سو کاتب نے آخری صفحے پر اپنا نام، محلہ، شغل، شہر اور وہاں کی آب وہوا سب کچھ لکھ مارا ہے جو نہایت بُری بات ہے۔ کاتب نے جگہ جگہ غلطیاں کی ہیں۔ اس نے کئی جگہ بالم کو سالن اور سیّاں کو سویّاں لکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت کاتب کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک جگہ حور شمائل نازنین کو چور شمائل نازنین لکھ کر افسانے کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ کاتب نے محاورے بھی غلط لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہوں: "سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے"۔ "الٹا کوتوال چور کو ڈانٹے"۔ "کُتّا دیکھے گا تو ضرور بھونکے گا" وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے آخر میں چند اشتہارات دیے گئے ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دکان کے مینجر صاحب نے اشتہار دیا ہے:۔

"کسی دوسری دکان پر جاکر دھوکا نہ کھائیے۔۔۔

ہمارے ہاں تشریف لائیے"

دوسرا اشتہار کتوں کے متعلق ہے۔ دو کُتّے فروخت کے لیے ہیں۔ اشتہار ہے:۔

"دو موٹے تازے کتے، ایک سیاہ دوسرا سفید، نہایت وفادار اور سمجھ والے، رات کو خوب بھونکتے ہیں۔ جو دے دو بڑے شوق سے کھا لیتے ہیں، بچوں کو خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔"

اب رہا افسانوں کے متعلق۔ سو ان میں ایک بھی ایسا نہیں جسے افسانہ کہا جا سکے۔ جگہ جگہ غیر ملکی ادب سے چوری کی گئی ہے۔ پلاٹ، مکالمے، اشعار، منظر، غرض یہ کہ ہر چیز غیر ملکی ہے۔

پہلے افسانے میں جہاں ہیرو بغیر لیمپ کے سائیکل چلاتا ہوا پکڑا جاتا ہے، یہ کسی مشہور انگریزی ناول سے نقل کیا گیا ہے۔ چوتھے افسانے میں جہاں ہیرو کی پٹائی ہوتی ہے اور ہیروئن سے پٹ پٹ کر اس کا برا حال ہو جاتا ہے، یہ حصہ ہُو بہُو رُوسی ناول "پول پول پوف" سے ماخوذ ہے۔ آخری افسانے میں جہاں ہیرو کے کپڑے چُرا لیے جاتے ہیں اور شبہے میں وہ خود گرفتار کر لیا جاتا ہے، وہ حصہ مشہور فرانسیسی شاہکار "لافش ڈی فُش" سے لیا گیا ہے۔ اور چھٹے افسانے میں جب ہیروئن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور وہ چیخیں مارتی ہوئی جنگل میں جا پہنچتی ہے اور وہاں ایک ریچھ کو ہیرو سمجھ کر اس کے کان کاٹ لیتی ہے، یہ ساری کہانی مشہور چینی ادیبہ مس پنگ پانگ کی معرکۃ الآرا کتاب "میاؤں میاؤں" کا ترجمہ ہے۔

قصہ مختصر ساری کی ساری کتاب اِدھر اُدھر سے چرائی گئی ہے۔ ہیرو کا حلیہ بیان کرتے وقت مصنّف فرماتے ہیں "اس کی عمر ہو گی کوئی بیس اور پینتالیس کے درمیان۔" بھلا بتائیے تو سہی کہاں بیس اور کہاں پینتالیس۔

افسانوں کے پلاٹ بالکل پھُسپھُسے ہیں۔ جہاں انہیں کسا ہوا ہونا چاہیے تھا

وہاں ڈھیلے ہیں اور جہاں ڈھیلا ہونا چاہیے تھا وہاں کس دیے گئے ہیں۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ "عین رات کے بارہ بجے میل ٹرین ڈونگہ بونگہ سے چلی اور سیدھی دیو لالی جا کر ٹھہری۔" اوّل تو ڈونگہ بونگہ لائن پر کوئی میل ٹرین نہیں چلتی۔ دوسرے یہ کہ ڈونگہ بونگہ نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ہے۔ اور دیو لالی جی آئی پی ریلوے میں۔ پھر رات کے بارہ بجے ڈونگہ بونگہ کے سٹیشن پر نہ کوئی ٹرین آتی ہے نہ وہاں سے کہیں جاتی ہے۔ اسی طرح مصنّف نے سردی کے موسم میں آم کھائے ہیں اور گرمیوں میں کپاس کے کھیت دیکھے ہیں۔ پہاڑوں پر کھجور کے درختوں کا ذکر ہے اور ریگستانوں میں آبشاروں کا۔

سچ مچ ہمیں یہ کتاب پڑھ کر بڑی وحشت ہوئی۔

اگر مصنّف کی یہ پہلی کتاب ہے تو انہیں صبر کر لینا چاہیے۔ اگر دوسری ہے تو حفاظت سے کام لینا چاہیے۔ اگر تیسری یا چوتھی ہے تو ان کی حالت پر افسوس ہے۔

ہم اب تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ آخر شتر بے مہاری صاحب نے یہ افسانے لکھے کیوں؟ اگر لکھے بھی تو کتابی صورت میں کیوں ترتیب دیے؟ اور یہ کتاب انہوں نے کیوں چھپوا دی؟ شتر صاحب اس دنیا میں آئے کیوں؟ شتر صاحب اب تک زندہ کس لیے ہیں؟ ——————"

کچھ اس قسم کا تھا وہ ریویو۔

آج ہم ایک ریویو لکھ رہے تھے۔ ہم نے اس پر بڑی محنت کی تھی۔ اتنے میں ایک پبلشر صاحب تشریف لے آئے۔ ہم نے ریویو پڑھ کر سنایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ بولے کس کتاب کا ریویو ہے۔ ہم نے کتاب کا نام بتایا۔ بولے اس نام کی تو کوئی کتاب آج تک نہیں چھپی۔ ہم نے کہا آپ ہی تو چھاپ رہے ہیں۔ وہ صاف مُکر گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہم یونہی ایک فرضی کتاب پر ریویو کر گئے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ لیکن ریویو کرنے والوں کو اس قسم کے واقعات سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خیر، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ریویو کرنا ایک زبردست آرٹ ہے اور اس کے بغیر ادب میں ترقی ناممکن ہے۔

ریڈیو

اس شام کو عجیب تماشا ہوا۔ جب میں کھیل کود کر تھکا ہوا واپس آیا تو غلطی سے ریڈیو کے پاس جا بیٹھا۔ پروگرام پڑھا تو جی للچا اٹھا۔ ایک سٹیشن سے ایک بوڑھے تجربہ کار شکاری اپنی زندگی کے حالات سُنا رہے تھے۔ دوسرے سٹیشن سے ایک فلمی ہیرو اپنی رومان انگیز زندگی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اور تیسرے سٹیشن سے ایک ماہرِ نفسیات بزرگ، بچوں کی نفسیات اور تعلیم و تربیت پر تقریر فرما رہے تھے۔

تینوں پروگرام ایک ہی وقت شروع ہونے والے تھے۔ سوچا کہ بچوں سے ہمارا کیا واسطہ؟ اب رہی وہ ایکٹر صاحب کی داستانِ حسن و عشق، اسے سُن کر خواہ مخواہ رشک آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ شکاری صاحب کی باتیں سُنی جائیں۔ بندوق تو ہمیں بھی چلانی آتی ہے۔

کیا جانے کیا خرابی تھی' وہ سٹیشن ہی نہ ملتا تھا۔ عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں۔ قوالیاں ہو رہی تھیں۔ سیٹیاں بج رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے۔ لیکن وہ سٹیشن ہی نہیں لگتا تھا۔ موسم بھی کچھ ایسا خراب نہ تھا۔ سوچا شاید ریڈیو بگڑ گیا ہے۔ آخر تنگ آ کر رُستم میاں کو بلایا جو ریڈیو کے عاشق تھے۔ ریڈیو ان کے سپرد کر کے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ رُستم کو فوراً وہ سٹیشن مل گیا۔ شکاری صاحب تقریر شروع کر چکے تھے۔ آواز آئی ـــــ

" ہاتھی کا شکار بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ہاتھی سپورٹس مین بالکل نہیں ہوتا۔ ہاتھی ایک کینہ خو اور کینہ نواز جانور ہے۔ اگر کوئی ہاتھی سُن رہا ہو تو مَیں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ اگر ہاتھی ایسا نامعقول نہ ہوتا تو شکاریوں سے اتنی سی بات پر خفا کیوں ہوتا۔ شکاری فقط اسے مار ڈالنا ہی چاہتے ہیں نا' اور تو کچھ نہیں چاہتے اور اتنی سی بات کے لیے اتنا بغض رکھنا' بدلے لینا' یہ کرنا' وہ کرنا۔ یہ سب باتیں ہاتھی کو انسانیت سے گرا دیتی ہیں۔ اور جانوروں کو دیکھیے' شکاریوں سے کتنی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ دسمبر کی دسویں تاریخ تھی اور یہی رات کے کوئی گیارہ بجے تھے۔ مَیں جنگل میں بیٹھا ایک ہاتھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کم بخت نے بڑا پریشان کیا۔ آخر رات کے کہیں دو بجے آیا۔ اکیلا نہیں' ایک اور ہاتھی کو بھی ساتھ لے آیا۔ مَیں نے گولی چلائی۔ تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب مَیں نے دیکھا کہ وہ گولی فقط ایک ہاتھی کو لگی۔ دونوں ہاتھیوں کو نہیں لگی۔

ایک ہاتھی وہیں بیٹھ گیا۔ دوسرا میری طرف لپکا۔ اگلے روز مجھے پتا چلا کہ وہ ہتھنی تھی ـــــ یعنی مسز ہاتھی۔ خیر تو ہتھنی نے اپنے سونڈ سے درخت کی کئی ٹہنیاں توڑ دیں اور مجھے بھی نیچے پٹخ دیا۔ غالباً میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا۔ میں گرتے ہی اچھلا اور اچھلتے ہی پھر گرا۔ پھر اٹھا۔ جلدی سے گرا اور اُٹھ کر بھاگا۔ ہتھنی نے تعاقب کیا۔ کوئی پندرہ میل تک بھاگتا چلا گیا ـــــ ٹھہریے، پندرہ نہیں یہی کوئی دو تین میل بھاگا ہوں گا یا شاید اس سے بھی کم۔ میں نے موقع پاکر ہتھنی کو چکر دیے اور ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ ہتھنی نے منٹوں میں اس درخت کو بھی گرا لیا۔ میں زندگی سے بالکل ناامید ہو چکا تھا اور آخری حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے ہتھنی کے سامنے کھڑے ہو کر نشانہ باندھا اور گھوڑا دبا دیا ـــ بندوق کا گھوڑا ـــ میں خود گھوڑے پر سوار نہیں تھا۔ بندوق سے کچھ نہ نکلا۔ اندر کارتوس ہوتا تو کچھ نکلتا بھی۔ اب ہتھنی سونڈ اُٹھا کر چنگھاڑتی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے ـــــ لیکن پھر میں نے کیا کیا؟ ہمت کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں سے لگا کر کہا کہ اگر تمہیں میری زندگی سے نکال دیا جائے تو میری زندگی بالکل ویران ہو جائے گی، بالکل اُجاڑ رہ جائے گی۔ تمہارے دم سے میری ظلمتیں منوّر ہیں۔ تمہاری ہی یہ ساری چہل پہل ہے۔ وہ کچھ مسکرائی اور میں غش کھاتے کھاتے بچا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ چاروں طرف

خاموشی تھی۔ فقط ایک اُلّو تھا جو اپنی سریلی آواز سے اس خاموشی کو توڑ رہا تھا۔ ہمارے سر پہ تاروں کی چھت تھی اور پاؤں کے نیچے زمین تھی۔ ہمارے سامنے مشرق تھا، پیٹھ پیچھے مغرب، دہنے بازو جنوب تھا اور بائیں ہاتھ شمال ۔۔۔ ایسی رومان انگیز فضا میں میں نے اظہارِ محبّت کیا اور اس نے مسکرا کر گردن جھکا لی۔

جب دل کی دھڑکن ذرا دُور ہوئی تو میں نے اس کا ہاتھ پھر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ غالباً میں نے یہ نہیں بتایا کہ ذرا پہلے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ یک لخت دل نے کہا کہ ہمّت کرو اور آج ہی زندگی بھر کے لیے پیمانِ وفا باندھ لو۔

چنانچہ میں نے ہمّت کی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا:
"کیا تم میری التجا مانو گی؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا ۔۔۔۔ میں اُسکے سامنے کھڑا ہو گیا اور چلّا کر بولا "یہ سمجھ لو، میں تم سے آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ اگر تم سکول نہ گئیں تو یقیناً پٹ جاؤ گی۔ ایسی ضدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آنے دو تمہاری امّی کو۔ دیکھنا تمہاری کیسی گت بنواتا ہوں۔" اُدھر اس نے مچلنا شروع کر دیا۔ پہلے تو صرف مچلتی رہی پھر ٹھنکنا اور باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ بہتیرا منایا۔ مٹھائی کے وعدے کیے۔ سینما کا لالچ دیا۔ بہتیری منت سماجت کی لیکن اس کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ یہ بچّے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان سے ذرا شرافت سے پیش آؤ تو اکڑ جاتے ہیں۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ ان میں رشک کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے پڑوس کے ایک بچّے کی تعریفیں شروع

کردیں۔ میں نے کہا ذرا مُنو کو تو دیکھو۔ کتنا پیارا بچّہ ہے! کبھی آج تک ضد نہیں کی۔ نہ کبھی تمہاری طرح روتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے پیٹ بھی دو تو بھی نہ روئے گا۔ تم سے وہ لاکھ درجے اچّھا ہے۔ اس کی عادتیں نہیں دیکھیں تم نے؟ کتنی اچھی اور سُدھری ہُوئی ہیں —— اُس کی ہر بات سے یہ صاف عیاں ہے کہ وہ سب سے مختلف ہے۔ ہمیشہ علی الصباح اُٹھتا ہے۔ ابھی اندھیرا ہی ہوتا ہے کہ وہ پانی پینے جاتا ہے۔ پانی پی کر زور سے ڈکارتا ہے اور سارا جنگل گونجنے لگتا ہے۔ چرند، پرند، درند سب جاگ اُٹھتے ہیں۔ اس کے بعد شیر شکار کھیلنے نکل جاتا ہے۔ دوپہر کو بیوی بچّوں کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتا ہے۔ شام کو شیر ورزش کرتا ہے یا کسی دوسرے جنگل کے شیر کے ہاں ملنے چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات دوسرے جنگلوں کے شیر اپنے کنبوں کے ساتھ اس کے ہاں آجاتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد شیر کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں جنگل کا ہر جانور شرکت کرتا ہے۔ اس وقت شیر اگلی صبح کے شکار کے لیے چند موزوں جانور منتخب کرلیتا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے شیر ایک مرتبہ پانی پینے ضرور جاتا ہے۔ دراصل شیر کو پیاس بہت لگتی ہے۔ شیر کو شکار کرنے کا بہترین وقت وہ ہے جب وہ پانی پینے جارہا ہو —— جب وہ پانی پینے کا ارادہ رکھتا ہو اور یہ ظاہر کردے کہ اسے پیاس لگی ہے، تو بھی کوشش ہونی چاہیے کہ اسے دودھ پلایا جائے۔ اسے حتیٰ الوسع پانی نہ دیا جائے،

کیونکہ اس طرح اُس کے معدے پر بُرا اثر پڑے گا۔ دودھ میں شکر کم ہونی چاہیے۔
مَیں تو یہ کہوں گا کہ بغیر شکر کا دودھ سب سے اچھا ہے۔ کئی لوگ بچّوں کو یخنی پلاتے
ہیں۔ مَیں اس کے سخت خلاف ہوں۔ مَیں نے آج تک بچّوں کو کوئی ثقیل
چیز نہیں پلائی۔ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ دودھ پیتے وقت بچّے کا دھیان
کسی اور طرف ہونا چاہیے۔ مثلاً ریڈیو بج رہا ہو۔ ریڈیو پر کوئی تقریر ہو رہی ہو
یا پکّا راگ ہو رہا ہو۔ بچّے پکّے راگ بہت پسند کرتے ہیں اور تقریریں
سُن کر وہ بہت محظوظ ہوتے ہیں ــــــ قصّہ مختصر اگر موسیقی ہو تو بہت اچھا
ہے کیونکہ رومان اور موسیقی کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ خاص طور پر
اظہارِ محبّت کے وقت اگر خوش قسمتی سے آس پاس کوئی گا رہا ہو یا ستار بجا رہا
ہو تو بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اگر بالکل نزدیک ڈھول بج رہا ہو تو خوش نصیبی
ہے ــــ موسیقی کی سفارش سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ التجائے محبّت قبول ہو جاتی
ہے۔ مجھے وہ رات نہیں بھولتی جب مَیں نے ایک سنگدل کے قدموں پر اپنا دل
رکھ دیا تھا۔ وہ رات کتنی پیاری تھی، کتنی دلفریب تھی۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔
صرف چند جھینگر گا رہے تھے۔ ورنہ ہُو کا عالم تھا ــــ میں بالکل خاموش تھا کہ اتنے
میں آہٹ ہوئی اور چند بندر بڑی تیزی کے ساتھ میرے سامنے سے گزر گئے۔
دفعتہً مَیں نے ایک سایہ دیکھا جو میری طرف آ رہا تھا۔ یہ ایک ریچھ تھا۔ میں نے
بندوق سنبھالی اور سانس روک کر بیٹھ گیا۔ لیکن ریچھ نے عقل مندی اور دور اندیشی

سے کام لیا اور راستہ تبدیل کر لیا۔ اتنے میں ایک بھیڑیا میرے پاس آکھڑا ہوا جسے میں نے ہشت کہہ کر بھگانا چاہا۔ وہ نہ بھاگا۔ پھر اسے ڈرایا دھمکایا لیکن وہ وہاں سے بالکل نہ ہلا اور سامنے کھڑا ہو کر گھورنے لگا ـــــ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے زور سے تھپڑ مارا۔ تھپڑ لگنا تھا کہ اس نے بڑے زور سے رونا شروع کر دیا۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں بہت گھبرایا کیونکہ اس کی چیخ پکار سے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ جب وہ بلک بلک کر رو رہا تھا تو مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ بچے کو مارنا نہیں چاہیے۔ نرمی سے سمجھانا چاہیے، محبت اور پیار سے۔ اگر اسے چمکار کے کوئی بات کہی جائے تو بچہ فوراً مان جاتا ہے۔ محبت کی بدولت ناممکن سے ناممکن کام ممکن ہو جاتے ہیں ـــــ محبت تو سب سے بڑا جادو ہے لیکن ہمت کبھی نہیں ہارنی چاہیے۔ اپنی قسمت سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ بڑے اطمینان اور سکون سے محبت کرنی چاہیے۔

میں خود بارہا آزما چکا ہوں۔ خودداری ہی وہ چیز ہے جس کی محبت میں اشد ضرورت ہے اور یہ بھی سو فیصد صحیح ہے کہ سچے دل سے کی ہوئی محبت کبھی ضائع نہیں ہوتی ـــــ ممکن ہے کہ آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہوں۔ اگر واقعی آپ مذاق سمجھ رہے ہیں تو بڑا افسوس ہے۔ آپ یقین کیجیے یہ بے حد سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس پر ایک معصوم زندگی کا انحصار ہے۔ بھلا خوراک اچھی نہ ملی تو تربیت

کیا خاک ہو گی؟ آپ کا فرض ہے کہ بچّے کی پوری پوری نگہداشت کریں۔ اس کی خوراک کا خاص خیال رکھیں۔ نوکروں پر ہرگز اعتبار نہ کریں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک نوکر چند ماہ کے بچّے کو قیمہ اور پراٹھے کھلا رہا تھا۔ اور بچّہ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ ایک اور نوکر نے دودھ پیتے بچّے کو سالم مرغ بھون کر کھلا دیا۔ نوکر ہمیشہ بے احتیاطی کرتے ہیں اور بچوں کا معاملہ بڑا نازک ہے —— ذرا سی بے احتیاطی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا ہے۔ نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ زنگ لگ جاتا ہے۔ شکل بگڑ جاتی ہے۔ حلیہ تبدیل ہو جاتا ہے قصّہ مختصر بے احتیاطی سے بندوق کا ستیاناس ہو جاتا ہے اس لیے بندوق کو ہفتے کے ہفتے صاف کرنا چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہ کام خود کریں۔ سب سے پہلے آپ بندوق کو بالکل خالی کر لیں کیونکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کارتوس اندر رہ گئے اور چل پڑے۔ ایسے کئی حادثے ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد پھر خالص بندوق کے تیل کی مالش کریں —— اور غور سے دیکھتے جائیں کہ کہیں چھوٹا موٹا سا سوراخ تو نہیں یا کہیں سے ٹوٹ پھوٹ تو نہیں گئی، کیونکہ ذرا سا سوراخ ہوا تو دودھ باہر نکل جائے گا اور بچّہ بھوکا رہ جائے گا۔ ویسے دودھ پلانے کی یہ بوتل اپنا جواب آپ ہی ہے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچّہ جب چاہے دودھ پی سکتا ہے اور جب چاہے انکار کر سکتا ہے بوتل کے ساتھ ایک پرچہ بھی ملتا ہے جس میں ہدایات ہوتی ہیں۔ میں آپ کی سہولت

کے لیے ہدایات پڑھے دیتا ہوں۔ سنیے: جب بچہ ایک مرتبہ دودھ پی چکے تو اسے گرم پانی میں ڈال دیجیے (بوتل کو)۔ اور جب بچہ دو تین روز بوتل استعمال کر چکے تو اسے کھولتے ہوئے پانی میں اچھی طرح ابالا جائے اور تمام حصوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ رکھ دیا جائے (بوتل کے حصوں کو)۔ اور بچے کو دودھ پلاتے وقت اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہیے (بچے کے سر پر)۔ اور ہر روز استعمال سے پہلے اسے دھوپ میں سکھا کر صاف کر لینا چاہیے (بوتل کو)۔ بچے کو بہلا پھسلا کر اور چمکار چمکار کر دودھ پلانا چاہیے اور یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر آپ نے بچے کو ایک مرتبہ بھی دھمکا دیا تو اس کے دل میں نہ صرف آپ کا ڈر بیٹھ جائے گا بلکہ بوتل کا بھی۔ اور ممکن ہے وہ ایک دن بڑا ہو کر آپ ہی کو دھمکائے گا۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بچے کو اپنے پاس بٹھا لیں۔ پہلے اسے گدگدائیے اس کی ہتھیلیوں اور تلووں میں گدگدی کریں۔ جب وہ ہنسنے لگے تو اسے اور بھی گدگدائیں۔ پھر اسے خوب پیار کریں —— اس کے بعد اس کی گود میں سر رکھ کر اپنے دل کے راز کہہ دیں اور یہ شعر ضرور پڑھیں۔

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

پھر بڑے مؤثر لہجے میں کہیں کہ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں یا تو خودکشی کر لوں گا یا اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔ یہ سب تمہاری محبت کا قصور

ہے۔ میرا قصور ہرگز نہیں۔ اگر ہوا تو آنکھوں کا قصور ہوگا۔ یہاں آپ ضبط سے کام لیں۔ اگر آپ نے وہ

ع آنکھوں کا تھا قصور چھُری دل پہ چل گئی

والا شعر پڑھ دیا تو سارا کیا کرایا مٹی میں مل جائے گا۔ جواب کا انتظار ضرور کریں ممکن ہے کہ جواب میں دیر ہو جائے لیکن جواب ضرور ملے گا ـــــ جواب ہمیشہ ملتا ہے۔ مختلف جانور مختلف طریقوں سے جواب دیتے ہیں۔ ریچھ چھیڑ کا جواب تھپّڑ سے دیتا ہے۔ شیر کو چھیڑ دو۔ فوراً کاٹ کھائے گا۔ اونٹ کچھ نہیں کہتا مسکرا کر معاف کر دیتا ہے۔ ہاتھی سونڈ سے وہ زور کا چابک رسید کرتا ہے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ چیتا دُم سے گدگدیاں کرنے لگتا ہے۔ گینڈا پہلے تو سوچنے لگتا ہے پھر یک لخت نزدیک آکر ایک زبردست دُلتّی مارتا ہے۔ دریائی بکرا چھیڑ کا جواب چھیڑ سے دیتا ہے ـــــ لیکن جواب ضرور ملتا ہے۔ جواب جواب میں بھی فرق ہے اور اگر محبّت کا جواب محبّت سے نہ ملے تو زندگی بیکار ہے۔ اس صورت میں انسان کو فوراً مر جانا چاہیے۔ اگر وہ نہ مر سکے تو خودکشی کر لینی چاہیے۔ خودکشی نہایت اچھی چیز ہے۔ صحت کے لیے مفید ہے۔ میں خود پانچ چھ مرتبہ خودکشی کر چکا ہوں۔ معاف کیجیے۔ میرا مطلب ہے کہ خودکشی کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ خودکشی کی کوشش کرنا بھی خودکشی کے برابر ہے۔ دونوں کا ایک سا درجہ ہے۔ ایک سی عزت ہے اور ایک سا ثواب ہے ـــــ کھڑ ڈھڑ ـــــ

شوں — چٹاخ — چوں چوں — میاں مٹھو ہوں۔ — کھڑڑ — نمک دو روپے چھٹانک — گیہوں ساڑھے پندرہ آنے سیر، ماش پونے دو روپے من، بیلوں کی جوڑی ستّر روپے، ہاتھیوں کی جوڑی چار سو روپے کی، بندروں کی جوڑی مفت اور الّوؤں کی جوڑی بالکل مفت — موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گیوری — موہے چھیڑ گیوری — آں ہاں ناما نا نا گیوری — واسکوڈی گاما یا دھانی سا گیوری ——

آج چھٹے مہینے کی چھٹی تاریخ ہے اور اس وقت چھ بج کر چھ منٹ ہیں۔ آپ فارسی میں خبریں سنیے یا چلیے رہنے دیجیے — کل دہلی میں پانچ منٹ بارش ہوئی تھی جس سے ملتان میں بڑی خوشیاں منائی جا رہی ہیں — کھڑڑ — کھڑڑ — !

مَیں ہڑبڑا کر اٹھا اور ریڈیو بند کر دیا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چیز تھی جو ابھی ابھی سُنی۔ رستم میاں قسمیں کھا رہے تھے کہ وہ ریڈیو کے پاس بیٹھے ضرور تھے لیکن انہوں نے اسے چھیڑا بالکل نہیں اور یہ ساری شرارت ریڈیو کی تھی۔

مان نہ مان

کردار

زینت	اسلم کی بیوی
اسلم	زینت کا خاوند
لطیف	اسلم کا دوست
اسلم	لطیف کا دوست
نبوؔ	اسلم کا نوکر
اسلم	نبوؔ کا آقا

ایک ریڈیو اور ایک ٹیلیفون

پہلا سین

(ایک کمرہ ـــــ جیسے اکثر مکانوں کے کمرے ہوا کرتے ہیں)

ایک طرف ریڈیو رکھا ہے۔ ساتھ ہی ایک کرسی پر زینت بیٹھی ریڈیو سُن رہی ہے۔ پہلے کسی ریکارڈ کا آخری حصّہ بجتا ہے پھر ــــ "یہ لاہور تھا۔ میرا مطلب ہے، یہ لاہور ہے۔ ابھی آپ نے فلم خوفناک بھلبھڑی کے ریکارڈ سُنے۔ اب شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ اب ہمارا عورتوں کا پروگرام شروع ہوتا ہے۔ یعنی اگر مرد چاہیں تو بے شک نہ سنیں۔ پہلے آپ کو مسز حسرت ہاشمی اپنی تقریر پڑھ کر سنائیں گی جس کے متعلق ان کا اصرار ہے کہ یہ ان کی اپنی لکھی ہوئی ہے۔ اور قدرے طبع زاد بھی ہے۔ اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ انہوں نے کہیں سے چرائی ہے یا ان کے خاوند نے لکھ کر دی ہے۔ خدا کرے یہ انہوں نے خود لکھی ہو۔ عنوان ہے عورت اور فیشن ــــ نہیں نہیں ــــ فیشن اور عورت ــ ویسے بات ایک ہی ہے۔ آئیے مسز حسرت ہاشمی!"

مسز حسرت ہاشمی : خواتین و حضرات ــــ اوہ معاف کیجیے ــــ صرف خواتین! ہاں تو پیاری بہنو! میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ مرد خواہ ایورسٹ پر چڑھ جائیں، سمندر کی تہہ میں چہل قدمی کریں یا اسی قسم کا کوئی اور بے تکا کام کر بیٹھیں لیکن یہ ہرگز نہ پتا چلا سکیں گے کہ عورت فیشن سے متاثر ہے یا فیشن عورت سے!

(ایک موٹر کے آنے اور رکنے کی آواز۔ کار کا دروازہ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

اور باہر سے قدموں کی چاپ)

زینت : (آواز دے کر) ننھّو! — جاؤ دیکھو شاید صاحب آئے ہیں۔

ننھّو : (دوسرے کمرے سے) بہت اچھا جناب۔

مسز حسرت ہاشمی : یہ ہر حال اس سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ بننے سنورنے کا مادہ عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ اسے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ آج کون سی خوشبو لگائی جائے۔ کون سا لباس پہنا جائے۔ کس قسم کے بال بنائے جائیں۔ اور —

(اسلم داخل ہوتا ہے۔ دفتر سے تھکا ماندہ گھر آیا ہے اس لیے مزاج ذرا چڑچڑا ہے)

اسلم : یہ کیا بیکار باتیں سُن رہی ہو؟

زینت : لاہور سے عورتوں کا پروگرام ہو رہا ہے۔

اسلم : بھلا یہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے؟

زینت : عورتوں کا پروگرام عورتیں ہی سنا کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس وقت میری ایک سہیلی تقریر کر رہی ہیں۔

اسلم : اخاہ! تو یہ محترمہ تمہاری سہیلی ہیں۔ سبحان اللہ!

زینت : الٰہی خیر! — خود تو چاہے سارا سارا دن ریڈیو پر دنیا بھر کی فضول خبریں سنا کرو۔ نگوڑا کرکٹ کا میچ، ٹینس کا میچ، کھیل کوئی رہا ہے اور یہ تاب

کوئی ہو رہا ہے۔ اِدھر مَیں نے ذرا سی کام کی بات سننے کے لیے ریڈیو کھولا
اور جناب ناراض ہونے لگے۔

اسلم : اچھا بتاؤ اس وقت کون سی کام کی بات ہو رہی ہے؟

زینت : اس پروگرام میں اکثر ایسی مفید باتیں سنائی جاتی ہیں جو ہر کسی کو
معلوم نہیں۔ آج بات کیا ہے؟ بات بات پر بگڑتے کیوں جا رہے ہو؟

اسلم : سر میں سخت درد ہے۔

زینت : تبھی تو۔ میں بھی کہوں کیا بات ہے ورنہ تمہیں چڑچڑا ہوتے میں
عموماً آدھ گھنٹہ لگتا ہے۔

(ریڈیو بند کر دیتی ہے۔ نبّو آتا ہے)

نبّو : صاحب! باورچی خانے یعنی غسل خانے میں گرم پانی لگا دیا ہے۔

اسلم : (غصے میں) تجھ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میں دفتر سے آتے ہی نہیں
بلکہ ٹھہر کر نہاتا ہوں۔ اب پانی پڑا پڑا گرم ہو جائے گا۔

زینت : یعنی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جائے گا۔؟

اسلم : (زور سے) ہاں ٹھنڈا ہو جائے گا ــــ

زینت : یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ مانا کہ تمہارے سر میں درد ہے مگر اس
کے معنی یہ تو نہیں کہ بلا وجہ کسی پہ ناراض ہونے لگو۔ آخر روز دفتر سے آتے
ہی نہاتے ہو۔ نبّو نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ اسلم ریسیور اٹھاتا ہے)

اسلم : میں اسلم بول رہا ہوں — جی ؟ — بالائی آمدنی — اوہ بالائی — حلوائی ؟ — اچھا — پانچ سیر دودھ اور آدھ سیر بالائی — ڈیری فارم ؟ — معاف کیجیے گا یہ ڈیری فارم نہیں۔

(ریسیور پٹخ دیتا ہے)

اسلم۔ لاحول ولاقوۃ، عجب احمق ہے کوئی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

اسلم۔ (جھنجھلا کر ریسیور اٹھاتا ہے) ہیلو — میں اسلم بول رہا ہوں۔ آپ کس نمبر کو بلا رہے ہیں ؟ کیا کہا آدھ سیر بالائی کا آرڈر اور بڑھا دوں ؟ بہت اچھا — ! (ریسیور کو دے مارتا ہے)

اسلم۔ کل مجھے یاد دلانا، ٹیلیفون والوں کو چھٹی لکھنی ہے۔ ناک میں دم کر دیا ان جاہل غلط نمبر ملانے والوں نے۔ ابھی کل ہی کوئی حضرت کسی جانور کی فروخت کے سلسلے میں مشورہ لے رہے تھے۔ اس سے پہلے ایک صاحب نے جوتوں کا آرڈر دیا تھا۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

اسلم۔ (دانت پیس کر) اوہ امیر اسر۔ اب کے میں ضرور کچھ سنا دوں گا۔ (ریسیور اٹھا کر) سنیئے صاحب — اگر آپ کو نمبر ملانا نہیں آتا تو پہلے سیکھ کر آئیے۔

سمجھے ؟ ــــ بس ! بھاگ جاؤ ــــ ہیں ؟ کون بول رہا ہے ــــ ؟ یار معاف کرنا ابھی کسی مسخرے نے تین چار دفعہ غلط نمبر ملایا۔ میں سمجھا تم وہی مسخرے ہو۔ اچھا سناؤ کب آئے ؟ ــــ اسی ٹرین سے ؟ اب کہاں ہو ؟ ــــ سٹیشن پر ؟ کیا کہا یہاں آ رہے ہو ؟ ہاں آج کل کوئی مہمان نہیں۔ مہمانوں والا کمرہ خالی پڑا ہے۔ تو کب پہنچ رہے ہو ؟ پندرہ منٹ میں ؟ اچھا تو پھر فوراً آؤ۔ زیادہ انتظار نہ کرانا ــــ

(ریسیور رکھ دیتا ہے)

اسلم۔ ایک تازہ ترین مصیبت آ رہی ہے۔

زینت۔ کیا ہوا ــــ یہ کون صاحب تھے فون پر ؟

اسلم۔ لطیف صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

زینت۔ خدا خیر کرے۔ کہیں اب کے بھی وہ دو مہینے ٹھہر گئے تو میں حسب معمول پاگل ہو جاؤں گی۔ اگر میں تمہارے دوستوں میں سے کسی سے گھبراتی ہوں تو ان لطیف صاحب سے۔ اور غالباً وہ بھی مجھ سے گھبراتے ہوں گے۔

اسلم۔ کیا بتاؤں تمہارا سابقہ تو ان سے ایک دو مرتبہ ہی پڑا ہے۔ سب دوست ان سے بھاگتے ہیں۔ کچھ نہ پوچھو۔ اس قدر خشک آدمی واقع ہوا ہے کہ کیا کہوں ــــ اور اس پر نام لطیف ہے۔

زینت۔ پچھلی مرتبہ جب تشریف لائے تھے تو سوائے اپنے متعلق باتیں

کرنے کے اُن کے منہ سے کوئی اور ذکر ہی نہ سُنا۔ دماغ چاٹ گئے۔ عجیب باتونی انسان ہیں۔ آپ نے کبھی انہیں ٹوکا بھی نہیں کیا؟

اسلم۔ ٹوکا ــــ یہ بھی ایک ہی کہی۔ بیسیوں مرتبہ ٹوکا۔ سینکڑوں دفعہ اشارے کیے۔ مگر وہ اللہ کا بندہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہر بات میں دخل۔ کوئی بلائے نہ بلائے، لطیف صاحب ہر دعوت میں دھرے ہوئے ہیں۔

زینت۔ تو گویا مان نہ مان میں تیرا مہمان۔

اسلم۔ جی! اور اوپر سے طرّہ یہ کہ حضرت جو کام کرتے ہیں وہ دوسروں پر احسان جتا کر۔

زینت۔ یعنی اب جو یہاں تشریف لا رہے ہیں تو گویا اُلٹا ہم پر احسان کر رہے ہیں؟

اسلم۔ جی، اس کا بھی کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟

زینت۔ ہے تو نہیں، لیکن گھڑا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کوئی ترکیب ایسی سوچی جائے کہ انہیں یہاں قیام کرنا مشکل ہو جائے۔

اسلم۔ ہاں خیال تو نامعقول ہے، مگر وقت اتنا تھوڑا ہے کہ ــــ

زینت۔ وقت کی فکر نہ کرو۔ اگر انسان چاہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ذرا سوچو تو سہی ــــ

(ایک وقفہ)

اسلم۔ (خوشی سے اچھل کر) سوجھ گئی، سوجھ گئی۔

زینت۔ کیا سوجھ گئی؟

اسلم۔ (سر ہلا کر) نہیں — کچھ نہیں۔

اسلم۔ (کچھ دیر کے بعد پھر اُچھل کر) اس مرتبہ سوجھ گئی۔

زینت۔ کیا سوچا؟ جلد کہو۔

اسلم۔ سنو اور ذرا کان کھول کر سنو۔

زینت۔ کچھ کہو بھی۔

اسلم۔ میرے خیال میں لطیفؔ صاحب کو یہاں سے ذرا بھگا دیا جائے۔

زینت۔ مگر کیونکر؟

اسلم۔ تم نہیں جانتیں کہ لطیفؔ کس قدر ڈرپوک انسان واقع ہوا ہے۔

زینت۔ تو پھر؟

اسلم۔ تو پھر بس ڈرا دیا جائے۔

زینت۔ لیکن کوئی چُوک نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ لطیف صاحب اپنا کوچ ملتوی کر کے یہیں ڈیرے ڈال دیں گے۔

اسلم۔ تم بے فکر رہو۔ نبوّ کو بلاتے ہیں۔ اسے بھی اس نیک کام میں شریک کرتے ہیں۔ اے نبوّ! (آواز دیتا ہے) ————

(نبوّ آتا ہے)

نبّو۔ آپ نے بلایا ہے ؟

اسلم۔ نبّو! تمہیں لطیف صاحب یاد ہیں ؟

نبّو۔ آپ کے دوست جو پچھلی مرتبہ دو مہینے ٹھہرے تھے ؟

اسلم۔ ہاں ہاں وہی۔ وہ صاحب اب پھر یہاں آ رہے ہیں۔

نبّو۔ تو کیا وہ پھر یہاں دو مہینے ٹھہریں گے ؟

اسلم۔ کیوں ؟ تم نے تو اس طرح کہا جیسے تمہیں ان کا یہاں ٹھہرنا پسند نہ ہو۔

نبّو۔ جناب! میری پسند نا پسند کیا چیز ہے۔ میں تو ملازم ہوں۔

اسلم۔ اچھا سچ سچ بتاؤ، لطیف صاحب سے تمہیں کیا شکایت ہے ؟

نبّو۔ جناب! میں کیا بتاؤں۔ انہوں نے تو پچھلی مرتبہ جان ہی نکال لی تھی۔

اسلم۔ وہ کیونکر ؟

نبّو۔ وہ تو ذرا ذرا سی بات پر اس طرح ڈانٹ دیا کرتے تھے کہ آپ نے بھی کبھی نہیں ڈانٹا۔ اور ــــ

اسلم۔ اچھا اچھا ہم سمجھ گئے۔ ایک کام کرو گے ؟

نبّو۔ ارشاد ؟

اسلم۔ ہم نہیں چاہتے کہ لطیف صاحب ایک رات سے زیادہ یہاں قیام فرمائیں۔ تم ہوشیار آدمی ہو تمہیں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ لطیف صاحب ذرا ڈرپوک واقع ہوئے ہیں۔ سمجھ گئے ؟

(نبوّ کھانا لگاتا ہے)

لطیف۔ (زور سے) تو ہم کھانا شروع کر دیں ؟

اسلم۔ (دوسرے کمرے سے) ہاں شروع کر دو، میرا انتظار نہ کرو۔

لطیف۔ اُدھر تم ہاتھ منہ دھو رہے ہو۔ اِدھر کہیں کھانے ہی سے ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔

اسلم۔ بس سمجھو آ ہی گیا ___ یہ لو ___ یہ آ گیا۔

(اسلم آتا ہے)

اسلم۔ کہو کیونکر راستہ بھول گئے ؟

لطیف۔ تم سے ملے بہت ہو گئے تھے ___ اور ہاں مسز اسلم ہمارا جی تو آج پراٹھوں کو چاہ رہا ہے۔ اللہ میاں نے پراٹھے بھی کیا نعمت بنائی ہے۔

زینت۔ ابھی لیجیے۔ نبوّ جاؤ۔ باورچی سے کہو کہ جلدی سے دھیمی آنچ پر پانچ چھ پراٹھے ڈال دے۔

لطیف۔ ہاں۔ کہو کہ ذرا جلد تیار کر دے۔ یہی کوئی آٹھ دس پراٹھے۔

اسلم۔ لو یار، یہ قورمہ نہایت عمدہ پکا ہوا ہے۔

لطیف۔ میرے دونوں ہاتھ رُکے ہوئے ہیں۔ تکلیف تو ہو گی، ذرا میری پلیٹ میں ڈال دو۔

اسلم۔ اور یہ کباب تو تم نے چکھے ہی نہیں۔

لطیف۔ بھئی تم دونوں بھی تو کچھ کھاؤ۔ ایمان سے، تم تو صرف کھانے کا شگون ہی کرتے ہو۔

زینت۔ مٹھاس تو چکھی ہی نہیں آپ نے۔

لطیف۔ اررر! یہ پڈنگ وہاں کیا کر رہی ہے؟

زینت: میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس پڈنگ کا کیا بنے گا۔ چلو اچھا ہوا لطیف صاحب کے کام آگئی۔

لطیف۔ یہ میری خوش قسمتی ہے۔ مگر مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں لطیف صاحب خود کام نہ آجائیں۔

اسلم۔ دیکھو بھئی! تم نے پھر تکلّف کیا۔

لطیف۔ آں ہاں، آپ جانتے ہیں کہ تکلّف کے لیے تو میں بنا ہی نہیں۔ اچھا تو لائیے، آپ کی خاطر کھا لیتا ہوں ورنہ رتی بھر گنجائش نہیں۔

اسلم۔ بھلا تمہارے پیٹ میں اور گنجائش نہ ہو؟ تعجب ہے! یہ بھی ایک ہی کہی۔ کالج کے زمانے میں تو بڑے خوش خوراک تھے ماشاء اللہ!

زینت۔ جی ہاں! میں نے بھی ان سے سنا ہے کہ کالج میں لڑکے آپ کو پیٹو نوجوان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

لطیف۔ آہ! وہ بھی کیا دن تھے! مسز اسلم، آپ نے بھی کیا یاد دلایا! ایک دفعہ ضد ہی ضد میں دو درجن انڈے اور ڈیڑھ درجن کیلے کھا گیا۔

زینت۔ الٰہی خیر! پھر کیا ہوا۔

لطیف۔ پھر کیا ہوا—— ہونا کیا تھا—— بس کھا گیا۔ اچھا بھئی بس! اب ہم سیر ہو گئے ہیں۔

زینت
اسلم } بس؟

لطیف۔ بس!

نبوؔ۔ صاحب! مَیں پلیٹیں اٹھا لوں؟

زینت۔ ہاں اُٹھا لو' اور کافی لے آؤ۔

اسلم۔ سگریٹ پیجئے گا؟

لطیف۔ مَیں تو کھانے کے بعد حقّہ پینے کا عادی ہوں۔ جو لطف حقّے میں آتا ہے وہ سگرٹ میں کہاں؟

اسلم۔ بشرطیکہ تمباکو اچھا بنا ہُوا ہو۔

لطیف۔ ہاں' چلم بھرنا بھی ایک زبردست آرٹ ہے لیکن بھئی اسلم! اگر کسی کو نفاست سے حقّہ پیتے دیکھا تو وہ زندہ حسن کو۔ کچھ نہ پوچھو بس۔

اسلم۔ ہوں! کہاں ہیں وہ آج کل—— نبوؔ! حقّہ لا جلدی کر۔

نبوؔ۔ ابھی لایا۔

لطیف۔ سُنا تھا کہ دہلی میں ہیں۔

اسلم۔ مَیں نے زندہ حسن کے بارے میں کئی اور عجیب باتیں سنیں۔
لطیف۔ اچھّا؟ ـــــ ہم بھی سُنیں۔

(نبّو حقّہ لاتا ہے)

اسلم۔ پچھلے سال مجھے کسی کام سے دہلی جانا پڑا۔ سوچا چلو لگے ہاتھ زندہ حسن سے بھی مِل لوں۔ عرصہ ہو گیا تھا انہیں دیکھے۔ ایک دوست سے ان کا پتا پوچھا۔ معلوم ہُوا حضرت کہیں دور قبرستان کے پاس ایک ٹوٹے پھُوٹے مکان میں رہتے ہیں۔ خیر صاحب گرتا پڑتا وہاں پہنچا۔ عجیب اجاڑ سی جگہ میں ان کا مکان تھا۔ چاروں طرف اندھیرا گھُپ۔ دروازے پر دستک دی ـــــ اندر سے آواز آئی ـــــ کون ہے؟ ـــــ مَیں نے کہا اسلم ـــــ اندر سے کوئی کوئی بولا " اخاہ اسلم! سناؤ بھئی کب آئے؟" مَیں نے کہا " باہر تو آؤ" کہنے لگے ـــــ " ابھی آیا" مَیں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ دو چار منٹ ٹھہر کر پھر آواز دی۔
جواب ملا " بھئی ابھی آیا۔ کپڑے بدل رہا ہوں" مَیں نے اور انتظار کیا۔
سوچا شاید اندر خستہ حالت ہو گی اور بلاتے شرم آتی ہو گی۔ بیچارے خود باہر آ رہے ہیں۔ اسی طرح چند منٹ اور گزر گئے۔ مَیں نے پھر آواز دی۔
" اب آ بھی جاؤ ـــــ گھنٹہ بھر سے باہر کھڑا ہوں" آواز آئی " بس ابھی آیا"
اتنے میں ایک سفید پوش بزرگ آ نکلے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو پوچھنے لگے۔
مَیں نے بتایا کہ زندہ حسن کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ وہ بولے کہ وہ تو یہ مکان ایک

سال سے چھوڑ چکے ہیں۔ اب یہ خالی پڑا ہے۔

لطیف۔ تو پھر اندر سے کون بول رہا تھا؟

اسلم۔ خدا جانے کون تھا؟

لطیف۔ اندر سے جو آواز آئی کیا وہ کسی زندہ آدمی کی نہیں تھی؟

اسلم۔ آواز تو بالکل زندہ حسن کی تھی۔

(نبوؔ کافی لاتا ہے)

زینت۔ کافی پیجیے لطیف صاحب!

لطیف۔ جی ہاں! ایک پیالی بنا دیجیے ـــــ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ۔

اسلم۔ کیا سوچ رہے ہو؟

لطیف۔ یہی کہ اندر سے جو صاحب بول رہے تھے اگر وہ سچ مچ باہر آجاتے تو کیا ہوتا؟

زینت۔ جانے دیجیے اب اس قصے کو۔ یہ بتائیے کہ آپ صبح چائے کتنے بجے پیتے ہیں؟

لطیف۔ صبح آٹھ بجے (اسلم سے) بھئی اسلم! یہ تم نے زندہ حسن کا ذکر چھیڑ کر میری طبیعت پریشان کر دی۔

اسلم۔ لاحول ولا قوۃ! کیا معمولی سی بات تھی۔ اچھا اب جا کر سوؤ۔ شب بخیر۔

(کچھ قدم جا کر پھر رک جاتا ہے) اور ہاں، تمہارا کمرہ دیکھ کر ایک بات یاد آگئی۔

لطیف۔ بھئی اب کوئی ایسا ویسا قصّہ نہ چھیڑو۔ مَیں پہلے ہی پریشان ہوں۔

اسلم۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم تو بڑے دلیر واقع ہوئے ہو۔

لطیف۔ دلیری سے اس کا کیا واسطہ۔ جانتے ہو میری طبیعت کو۔ کسی دوست کا ذکر سُن کر رہا نہیں جاتا۔

اسلم۔ اور تم بھی میری طبیعت سے واقف ہو۔ اپنے دوستوں کے قصّے سنائے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ جب ہم یہ مکان لینے لگے تو مالکِ مکان نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ مگر مَیں نے ہنس کر ٹال دیا اور کچھ پرواہ نہ کی۔

لطیف۔ کِس بات کی ؟

اسلم۔ کچھ نہیں ! یونہی مکان والے صاحب نے صرف اتنا کہا تھا کہ ایک دفعہ ان کے کسی عزیز کے کوئی دوست یہاں آکر ٹھہرے۔ رات کو اچھے بھلے سوئے۔ صبح اُٹھے تو ان کی حالت بہت عجیب تھی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ بس ایک لفظ تھا جس کا وِرد وہ کر رہے تھے۔ اور وہ تھا ـــ 'سَر کٹا' ـــ کہتے تھے اس مکان میں کوئی سر کٹا رہتا ہے۔

لطیف۔ سرکٹا ؟ کیا مطلب تھا ان کا ؟

اسلم۔ یہی کہ انہیں ایک ایسا آدمی دکھائی دیا جس کا سَر کٹا ہوا تھا۔ بالکل تن سے جُدا۔

لطیف۔ مگر ایسا انسان زندہ کیونکر رہ سکتا ہے؟

اسلم۔ کون مسخرہ کہتا ہے کہ وہ زندہ تھا؟ روح بھی کوئی۔ خیر، تو ان سر کٹے صاحب نے رات بھر انہیں خوب تنگ کیا۔ وہ دن اور آج کا دن، وہ صاحب بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔

لطیف۔ سر کٹے صاحب؟

اسلم۔ جی نہیں وہ مکان دار کے عزیز کے دوست۔ مگر مجھے یہاں کبھی کچھ نہیں دکھائی دیا۔ ہاں نوکر اکثر شکایت کرتے رہتے ہیں کہ انہیں سر کٹے صاحب ستاتے ہیں۔

لطیف۔ تم یہ مکان چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

اسلم۔ کہہ جو رہا ہوں کہ ہمیں کبھی نہیں ستایا انہوں نے۔

لطیف۔ (ڈر کر ہنستے ہوئے) لیکن یہ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آئندہ بھی نہیں ستائیں گے۔

اسلم۔ مگر تم کیوں ڈرتے ہو؟ اچھا بھئی! شب بخیر! بشرطِ زندگی صبح ملیں گے۔

لطیف۔ (کمزور آواز میں) بشرطِ زندگی ——— ایں؟ ——— اچھا شب بخیر۔

(لطیف جاتا ہے)

اسلم۔ (تیوّر سے) اگر ذرا سی بھی چُوک ہوئی تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔

نیّو۔ آپ بے فکر رہیں۔

اسلم۔ اچھا جاؤ۔۔۔ لیکن اپنا کام ذرا ٹھہر کر شروع کرنا۔

نیّو۔ اور جو وہ سو گئے تو؟

اسلم۔ تم بے فکر رہو۔ جو قصّے لطیف صاحب نے آج سنے ہیں وہ انہیں رات بھر جگانے کے لیے کافی ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

مہمانوں والا کمرہ۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ تھوڑی سی روشنی بھی ہے۔ لطیف بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ ایک دو مرتبہ کوئی سُر گنگناتا ہے۔ پھر چُپ ہو جاتا ہے۔

(باہر سے بلّی کی میاؤں سنائی دیتی ہے)

لطیف۔ (چونک کر) ۔۔۔ ہیں یہ کون؟ ۔۔۔ اوہ بلّی! ۔۔۔ واہ ۔۔۔ میاؤں (نقل اتارتا ہے)۔

(پھر میاؤں کی آواز آتی ہے)

لطیف۔ یہ بلّی کہاں سے بول رہی ہے؟

(اس مرتبہ میاؤں نہایت خوفناک آواز میں کی جاتی ہے)

لطیف۔ کون ہے؟

ننّو کی بدلی ہوئی آواز (باہر سے) کون ہے ؟

لطیف۔ تم کون ہو ؟ بولتے کیوں نہیں ؟

ننّو۔ بول تو رہے ہیں —— سن لو ——

لطیف۔ خدا کے لیے آخر تم ہو کون ؟

ننّو۔ (قہقہہ لگا کر ڈراؤنے انداز میں) مَیں کون ہوں ؟ پہچانا نہیں۔ (قہقہہ)

لطیف۔ (ڈرتے ہوئے) صاحب! مَیں آپ کو نہیں جانتا۔ دل لگی چھوڑیے۔ بتائیے آپ کون ہیں ؟

ننّو۔ اس کمرے کا مالک۔

لطیف۔ اس کمرے کا مالک ؟ اچھا آپ کیا چاہتے ہیں ؟

ننّو۔ ہا ہا ہا ! ہم کیا چاہتے ہیں ؟ تو گویا ہم بتا ہی دیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ بتا دیں ؟

لطیف۔ (ڈرتے ہوئے) آپ —— آپ جو کچھ بھی ہیں، تشریف لے جائیے۔ مجھے سونے دیجیے۔

ننّو۔ تم سونا چاہتے ہو ؟ ہم سلا سکتے ہیں۔ بالکل سُلا سکتے ہیں۔

لطیف۔ (ڈر کر) نہیں نہیں، مجھے معاف فرمائیے۔ میں خود سو جاؤں گا۔

ننّو۔ تم خود نہیں سو سکتے جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔

لطیف۔ (ذرا ہمّت دکھاتے ہوئے) آپ! آپ حکم دینے والے ہوتے کون

ہیں ؟

نبوّ۔ تمہاری زبان چلتی ہے۔ ہم اس کا بھی انتظام کیے دیتے ہیں۔

لطیف۔ (ڈرکر) نہیں نہیں، مَیں اب کچھ نہ بولوں گا۔ آپ مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔

نبوّ۔ ہم رات کو سویا نہیں کرتے۔

لطیف۔ مَیں تو رات کو اکثر سویا کرتا ہوں۔

نبوّ۔ نہیں۔ تمہیں آج ہمارے ساتھ جاگنا پڑے گا۔

لطیف۔ کوئی زبردستی ہے؟ آپ شوق سے ساری رات جاگیں ــ بھلا میں رات کو جاگ کر کیا کروں گا؟

نبوّ۔ ابھی ابھی چند اور سرکٹے حضرات آنے والے ہیں۔ ہم سب مل کر کچھ پئیں گے۔ ساتھ ساتھ برج (BRIDGE) ہوگا۔

لطیف۔ آخر میرا قصور؟

نبوّ۔ یہی کہ تم نے ہمارے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہم تمہاری روح قبض کریں گے۔

لطیف۔ (ڈرکر) نہیں نہیں جناب! مَیں کوئی اپنی خوشی سے تھوڑا ہی یہاں ٹھہرا ہوں۔ زبردستی ٹھہرایا گیا ہوں۔ آپ فرمائیں تو صبح ہوتے ہی فوراً کہیں چلا جاؤں۔

نبوّ۔ اچھا، ہم انتہائی رحم دلی سے کام لیتے ہوئے تمہیں رات بھر کی مہلت

دیتے ہیں۔ کل صبح آٹھ بجے کے بعد تم اگر اس مکان کے کسی حصّے میں بھی دکھائی دیے تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔

لطیف۔ مَیں بقیدِ ہوش و حواس خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا ـــــ

نیوّ۔ تم وکیل معلوم ہوتے ہو۔

لطیف۔ جی ہاں! بھلا آپ کو کیونکر پتا چلا؟

نیوّ۔ ہمیں سب چیزوں کے متعلق سب کچھ پتا ہے۔

لطیف۔ جی! تو مَیں قسم کھاتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔

نیوّ۔ نہ گئے تو پھر دوسرے جہان کو کوچ کرنا پڑے گا۔

لطیف۔ آپ بے فکر رہیے! صبح آٹھ بج کر پانچ منٹ کے بعد اس گھر میں ٹھہرنے والے پر تین حرف۔

نیوّ۔ شکر کرو کہ تم سے پہلے اس کمرے میں ٹھہرنے والے کی مرمت ہم کر چکے ہیں۔ ورنہ تمہاری گوشمالی ضرور کی جاتی۔ اچھا ہم جاتے ہیں۔

لطیف۔ شکریہ! مَیں حضور کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اچھا خدا حافظ!

نیوّ۔ بھولنا نہیں، ورنہ پھر حافظ خدا تمہارا ـــــ (نیوّ قہقہہ لگاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

دوسرے روز وہی پہلے سین والا کمرہ۔ میز پر چائے رکھی ہے۔ نبّو چینی کے برتن اور چمچے میز پر رکھ رہا ہے۔ کلاک آٹھ بجاتا ہے۔ اسلم اور زینت داخل ہوتے ہیں۔

نبّو۔ جناب! چائے لگ گئی ہے۔

زینت۔ اچھا، جاؤ لطیف صاحب کو بلا لاؤ۔

(جاتا ہے)

(ایک وقفہ)

اسلم اور زینت دونوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔

(لطیف داخل ہوتا ہے)

لطیف۔ (بڑی گرم جوشی سے) آداب عرض، آداب عرض۔

زینت۔ آداب عرض! سنائیے، رات تو آرام سے سوئے؟

لطیف۔ آرام؟ کچھ نہ پوچھیے۔ سوتے ہی ایسا بے ہوش ہوا کہ صبح ہی پتہ چلا۔

اسلم۔ ہیں؟ تو گویا آرام سے سوتے رہے رات بھر؟ تمہاری آنکھیں تو ایسی لال سی ہو رہی ہیں جیسے رات بھر جاگے ہو۔

لطیف۔ آنکھیں؟ آنکھوں سے کچھ اندازہ نہ کیجیے۔ یہ سُرخی نہیں، خمار ہے، بلکہ سچ پوچھو تو بھوک کا خمار۔

اسلم۔ لیکن چہرے سے تو کچھ اور ہی آثار نظر آ رہے ہیں۔
لطیف۔ کہہ تو دیا کہ یہ بھوک کا خمار ہے اور کچھ نہیں۔ اچھا ایک پیالی چائے تو دیجیے۔
اسلم۔ یہ لیجیے ـــ مَیں تو ڈرتا رہا کہ کہیں وہ سرکٹا تمھیں تنگ نہ کر رہا ہو۔
لطیف۔ اجی کیسے سر کٹے؟ وہاں تو کوئی سر والا تک نہیں آیا۔ ذرا دودھ اور ڈالیے۔ بس شکریہ۔
زینت۔ یہ لیجیے انڈے اور ٹوسٹ۔
لطیف۔ کچھ دلیا ہو گا؟
زینت۔ وہ بھی آ رہا ہے۔
لطیف۔ مَیں صبح کے وقت سیب کا مربّا اور پندرہ بادام چکھا کرتا ہوں۔ رہ گئیں نمکین چیزیں، سو یہی دو ایک پراٹھے، ایک آدھ کباب اور آملیٹ کی قسم کی چیزیں کافی ہوں گی۔ آپ لوگ صبح صبح شہد نہیں کھاتے کیا؟
زینت۔ جی نہیں۔
لطیف۔ اوہ آپ شہد سچ مچ نہیں کھاتے کیا؟ صحت کے لیے نہایت مفید چیز ہے۔ حد کرتے ہو بھئی!
اسلم۔ اب کھایا کریں گے۔
لطیف۔ مجھے ایک ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ اگر مَیں نے ہر روز دوپہر کو

بُھنا ہوا مُرغ نہ کھایا تو ــــ تو ــــ

اسلم۔ تو کیا ہو جائے گا؟

لطیف۔ ایک لمبی سی بیماری کا نام لیا تھا کہ وہ ہو جائے گی۔ مجھے اپنی صحت کا بڑا خیال رہتا ہے۔

اسلم۔ ہاں ہاں ضرور۔

(لطیف بدستور کھا رہا ہے)

لطیف۔ سہ پہر کی چائے کے متعلق کسی ڈاکٹر نے مجھے کوئی تاکید نہیں کی، البتہ ایک حکیم نے کہا تھا کہ تقویتِ قلب کے لیے انڈوں کا حلوا اور اونٹے ہوئے دودھ کا ایک گلاس سہ پہر کی چائے کے ساتھ ضرور ہونا چاہیے اور بعد میں فوراً ہی نمکین پستے، کچھ اخروٹ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے چکھ لیے جائیں۔

اسلم۔ خوب!

زینت۔ خوب!

لطیف۔ رات کے کھانے پر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ تمہارا باورچی بالکل معمولی سے کھانے پکاتا ہے۔ جب تک رات کے کھانے پر کوئی نرالی چیز، یعنی عجیب و غریب چیز نہ چنی جائے، تو نہ تو دن کی تھکاوٹ دور ہوتی ہے نہ رات کو اچھی طرح نیند آتی ہے۔ شاید اسی لیے تم دونوں کی صحت اب ایسی نہیں رہی جیسی پہلے تھی۔

اسلم - نرالی چیزوں سے تمہارا مطلب ؟
لطیف - وہ چیزیں بہتیری ہو سکتی ہیں - مثلاً گوشت کا حلوا، امرودوں کا شوربا۔ گوشت اور سنگتروں کا سالن - !

زینت
اسلم } گوشت اور سنگتروں کا سالن ؟

لطیف - جی ہاں اور مرغ کا حریرہ، بالائی کے کباب وغیرہ - باورچی شاید نہیں تیار کرنا نہ جانتا ہو لیکن مجھے ایسی بے شمار ترکیبیں یاد ہیں -

(کھانا ختم کر دیتا ہے)

زینت
اسلم } بس ؟

لطیف - جی ہاں ! بس ! اب ذرا میں ہاتھ دھو لوں -

(لطیف باہر جاتا ہے)

زینت - (آہستہ سے) یہ سُن لیا تم نے ؟ توبہ ہے الٰہی ! کون سے گناہوں کی سزا ملنے والی ہے ؟
اسلم - اور بھیجو بھٹو کو بھوت بنا کر، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا -
زینت - واہ، جیسے آپ تو اس سازش میں شریک تھے ہی نہیں کیسے معصوم بنتے ہیں ! (سہم کر) توبہ توبہ ـــــ سنگتروں کا سالن، مالٹوں کا حلوا، اناروں کے

کباب!

اسلم۔ آخر کیا کیا جائے؟

زینت۔ مجھے کیا معلوم؟ مَیں تو جاتی ہوں اپنی امّی کے ہاں۔

اسلم۔ اور مَیں بھی چلتا ہوں کسی دوست کے پاس۔

(لطیف تولیے سے ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آتا ہے)

لطیف۔ بھئی! یہ کیا کھُسر پھُسر ہو رہی ہے۔ ہم بھی تو سنیں۔ غالباً تم لوگ میرے آرام کا فکر کر رہے ہو۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ میرا کمرہ — ایسے آرام دہ کمرے مَیں نے بہت کم دیکھتے ہیں۔ اب رہ گیا میرے کھانے کا انتظام — ڈاکٹروں اور حکیموں کے بیش قیمت ارشادات کے مطابق جو پرہیزی غذائیں انہوں نے بتائی ہیں اس کا انتظام نبّو کر سکتا ہے۔

اسلم۔ نبّو! جس طرح لطیف صاحب کہیں اسی طرح کیا کرو۔

زینت۔ (مری ہوئی آواز میں) بس اسی طرح کیا کرو۔

لطیف۔ شکریہ! سُن رہے ہو نبّو۔

نبّو۔ جی ہاں، سُن رہا ہوں۔

(مختصر وقفہ۔ اسلم بے چین ہو رہا ہے)

اسلم۔ اچھا بھئی لطیف! اب مجھے اجازت دو۔ ایک نہایت ضروری کام ہے۔ کسی دوست سے ملنا ہے۔

زینت۔ اور مجھے بھی ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے۔ بہت ہی ضروری کام ہے۔ ان کے کام سے بھی زیادہ ضروری۔

لطیف۔ اچھا۔ لیکن دوپہر کو ذرا جلد تشریف لے آئیے۔ اور آج تو ناشتا بھی ہلکا پھلکا سا تھا۔

(زینت اور اسلم جاتے ہیں)

نبّو۔ تو صاحب! میں بھی ذرا باہر جا رہا ہوں۔۔۔ وہ میرے چچا۔۔۔!

لطیف۔ چچا وچا کچھ نہیں تم ہمارے پاس بیٹھو۔

نبّو۔ بہت اچھا حضور۔

(لطیف نبّو کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہے)

لطیف۔ ایک عجیب تماشا ہوا۔ رات کوئی ہمیں ڈرانے کی کوشش کرتا رہا۔

نبّو۔ اور آپ ڈر گئے کیا؟

لطیف۔ نہیں تو! ہم کیوں ڈرتے؟

نبّو۔ آپ کو ڈرانے کی کوشش؟۔۔۔ اجی یونہی کوئی بھوت یا چڑیل ہوگی۔ ورنہ کسی کی کیا مجال جو اس کوٹھی میں رات کو پھٹک بھی جائے۔

لطیف۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ کوئی بھوت ہی ہو۔ لیکن وہ اصلی بھوت تو نہیں تھا، انسان نما بھوت تھا۔

نبّو۔ (سہم کر) بھُوت نما بھوت تھا۔۔۔ ایں۔۔۔ بھوت نما انسان تھا؟ کیا فرما رہے ہیں۔۔۔؟ تو گویا آپ کو پتا چل گیا۔۔۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ۔۔۔

لطیف۔ ہاں ہاں! ہم تمہارا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ کہ وہ شخص یہاں پہنچا کیونکر؟

نبّو۔ نہ جانے کیوں کر پہنچا ہو گا۔۔۔ یعنی میں۔۔۔ یعنی مجھے بالکل پتا نہیں۔ مَیں تو رات کو کہیں باہر گیا ہُوا تھا۔

لطیف۔ نبّو! ہم نے سُنا ہے کہ تم اچھے خاصے مسخرے ہو۔۔۔!

نبّو۔ (چونک کر) مسخرہ ہوں۔۔۔ نہیں تو۔

لطیف۔ اور شاید تم تھیٹر میں پارٹ بھی کرتے رہے ہو۔ بس ایک بات ہمیں اور بتا دو کہ وہ شخص یہاں آ کیونکر گیا؟

نبّو۔ لیکن میں تو۔۔۔

لطیف۔ ہاں ہاں، تم تو رات بھر باہر رہے ہو۔ لیکن سوچنے میں کیا حرج ہے؟

نبّو۔ میرا خیال ہے کہ وہ شخص رات کے ایک بجے بڑے پھاٹک سے کُودا ہو گا۔ پھر اس نے باغ میں کھڑے ہو کر سوچا ہو گا کہ دیوار پھاند کر آئے یا اس اونچے سے آم کے درخت پر چڑھ کر دوسری طرف مرغیوں کے ڈربے پر کود جائے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا ہو گا کہ دیوار پھاندنا بہتر ہے کیونکہ ڈربے پر

کودنے سے مرغیاں جاگ اٹھیں گی اور شور مچادیں گی۔ بس تو جناب! وہ پھر چپکے سے برآمدے تک پہنچا ہو گا ـــــ

لطیف۔ ہاں ہاں! پھر ـــــ؟

نبو۔ تو پھر جب وہ برآمدے میں پہنچا ہو گا تو اسے کتے کی فکر پڑی ہو گی، لیکن کتا وہاں نہیں تھا ـــــ میرا مطلب ہے کہ کتا وہاں نہیں ہو گا۔ پھر وہ دبے پاؤں دروازے تک پہنچا ہو گا ـــــ اب وہاں پہنچ کر جو میں دیکھتا ہوں تو دروازہ بند ـــــ (ہڑ بڑا کر) صاحب! میں نہیں ـــــ یعنی جب اس نے دیکھا تو دروازہ بند ہو گا ـــــ

لطیف۔ اچھا تو پھر کیا ہوا ہو گا؟

نبو۔ جی، تو پھر اس نے جھانک کر دیکھا ہو گا کہ آپ سونے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ہو گی لیکن دروازہ تو آپ بند کر چکے تھے۔ مگر مجھے فوراً یاد آیا کہ دوسرے دروازے سے بھی ـــــ اُف! کیا واہی تباہی بک رہا ہوں۔ جناب! یہ میں اس شخص کی باتیں بتا رہا ہوں۔ شاید اس نے اسی طرح کیا ہو گا۔ میں تو ساری رات باہر رہا ہوں۔ یہ تو محض اندازہ ہے۔

لطیف۔ ہمارا بھی یہی اندازہ ہے۔ تم بتاتے جاؤ۔

نبو۔ تو پھر وہ چپکے سے دوسرے دروازے تک پہنچا ہو گا۔ اسے وہاں بڑی خوشی ہوئی ہو گی کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ یعنی کھلا ہو گا۔ اس کے بعد مجھے

یعنی کہ اسے ــــ یعنی کہ وہ ــــ !

لطیف۔ یعنی کہ اس نے، یعنی کہ تم نے، یعنی کہ وہ بولا ہوگا کہ میں بھوت ہوں۔ پھر اُس نے کہا ہوگا کہ کمرہ چھوڑ دو۔ پھر یعنی کہ تم ــــ یعنی کہ دونوں۔

نیّو۔ آپ یقین کریں یہ تو میں نے فقط اندازاً بتایا ہے۔

لطیف۔ میں بھی سب کچھ اندازاً کہہ رہا ہوں۔

(پردہ گرتا ہے)

زیادتی

نہ جانے کیا بات تھی۔ امتحان دینے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ امتحان کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ اس سے پہلے کتنی مرتبہ امتحان دیے تھے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ نہ گھر میں شور تھا نہ غل۔ مکمل خاموشی۔ ماحول امتحان دینے کے لیے بہترین تھا۔ وقت پر سب کچھ مل جاتا۔ جی چاہے ساری ساری رات پڑھتے رہو۔ کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں کہ کیوں پڑھ رہے ہو؟ کیا پڑھ رہے ہو؟ امتحان کی وجہ سے کوئی ملنے بھی نہ آتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود جی بے حد اداس تھا اور آج سے کئی سال پہلے کا۔ ایک امتحان رہ رہ کر یاد آرہا تھا' جس میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ایسا عجیب وغریب امتحان مَیں نے کبھی نہیں دیا تھا۔ میرے خیال میں آخری مہینے میں تو مَیں نے ایک حرف نہیں پڑھا تھا۔ پرچے بھی کیسے اُلٹے سیدھے کیے۔ سوالوں کے جواب

ایسے دیے جن کا نہ سر تھا نہ پیر۔ بیٹھا ہوں امتحان کے کمرے میں اور سوچ رہا ہوں رضیہ کے متعلق۔ خبر نہیں کہ کس مضمون کا پرچہ سامنے رکھا ہے۔ کیا سوال آئے ہیں اور میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اور جب نتیجہ نکلا تو میں پاس ہو گیا۔ کس قدر تعجب ہوا تھا اور ساتھ ہی کتنی خوشی ہوئی تھی۔ یکے بعد دیگرے رضیہ کے کئی تار آئے۔ جج صاحب اور بیگم نے بھی مبارک باد کے تار بھیجے۔ گھر سے بھی شاباش ملی۔ اور میں جو امتحان میں فیل ہو جاتا تو ساری شیخی دھری رہ جاتی۔ رضیہ کو تو کوئی نہ پوچھتا۔ سب کے سب میرے پیچھے پڑ جاتے کہ نالائق ہے پڑھتا نہیں تھا سینما دیکھتا رہتا تھا۔ سارا دن کھیلتا رہتا تھا۔ اور رضیہ نے جو جو شرارتیں کیں وہ اس وقت کتنی بری معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن انہیں دل میں دُہرانا کتنا اچھا لگتا تھا۔ اب وہی میں تھا، وہی زندگی تھی اور وہی امتحان۔ اب تنہائی بھی تھی، نہ کوئی ستاتا تھا، نہ چھیڑتا تھا۔

اچھی طرح یاد ہے کہ اتوار تھا جب میں نے ہوسٹل چھوڑا اور جج صاحب نے مجھے اپنی کوٹھی کا سب سے الگ تھلگ کمرہ اس لیے دیا کہ میں اچھی طرح پڑھ سکوں۔ امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی تھا۔ گھر سے ہر دوسرے تیسرے روز خط آتا کہ شاباش گھبرانا مت۔ مزے مزے سے امتحان دو۔ پھر کشمیر کی سیر کرنا ـــ یہ اور وہ ـــ طرح طرح کے لالچ دیے جاتے تھے۔ میں نے کتابیں ترتیب سے رکھیں اور سوچا کہ فقط آج کا دن اور ضائع

کر لیں۔ تھوڑا سا کرکٹ کھیل لیں۔ تھوڑا سا تیر لیں اور ایک پکچر دیکھ لیں۔ بس ! کل سے پڑھائی شروع کر دی جائے گی۔

تیرنے کے بعد ایک دوست نے مدعو کیا اور پکچر نہ دیکھ سکا۔ چنانچہ اگلا روز اسی سوچ میں گزر گیا کہ دیکھ لوں یا رہنے دوں۔ پھر سوچا خواہ مخواہ ایک بوجھ سا رہ جائیگا طبیعت پر۔ چلو دیکھ لیتے ہیں۔ میں چپکے سے باہر نکلا۔ فوراً رضیہ نے پکڑ لیا اور کہنے لگی "میں ابھی سب کو بتاتی ہوں کہ آپ سیکنڈ شو دیکھنے جا رہے ہیں" بڑی منتیں کیں۔ بولی "اچھا ہمیں ساتھ لے چلیے" میں بڑا سٹپٹایا۔ "اچھا اجازت لے آؤ جا کر"

"آپ خود اجازت لے آئیے، ابا لائبریری میں ہیں" وہ بولی۔ اور خوب بحث ہوئی۔ جج صاحب مجھے تو اجازت دے دیتے لیکن رضیہ ابھی پہلا شو دیکھ کر آئی تھی۔ بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ رضیہ گئی نہ میں۔ اور مجھے چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس آنا پڑا۔

اگلے روز علی الصبح کوئی گروپ فوٹو تھا۔ وہاں سے جب لوٹا تو دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں ایک مضبوط تالا لگا ہوا ہے اور چابی ندارد۔ چابی کی ڈھنڈیا پڑی۔ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ دوپہر تک میں برآمدے میں چہل قدمی کرتا رہا اور رضیہ اپنے کمرے سے جھانکتی رہی۔ آخر جھنجھلا کر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ وہاں شام تک پڑھتا رہا۔ جب واپس آیا تو تالا غائب

تھا۔ کمرہ کھولا۔ اندر سے کئی کتے چھلانگیں مارتے ہوئے میرے اوپر سے گزر گئے۔
یہ ضرور رضیہ کی کارستانی تھی۔

صبح صبح کتاب لے کر بیٹھا ہی تھا کہ ساتھ کے کمرے میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ کرسیاں گھسیٹی گئیں۔ میزیں الٹ دی گئیں۔ گلدان نیچے پھینک دیئے گئے اور رضیہ چھلاوے کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ ہاتھ میں اخبار تھا۔ چہرہ صبح کے تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح شگفتہ اور حسین تھا۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔

" یہ تازہ خبریں سنیں آپ نے ؟ بڑی مفید اور ضروری خبریں ہیں۔" وہ بولی۔

"جی نہیں۔ اوّل تو مجھے خبروں سے ایسی دلچسپی نہیں، دوسرے یہ کہ دوپہر کو ریڈیو پر سن لوں گا۔"

"خیر! اگر آپ اخبار پڑھنا نہیں چاہتے تو نہ پڑھیے۔ میں آپ کو سرخیاں سنا دیتی ہوں۔ پہلی خبر یہ ہے ــــــــــــ

"نئی دہلی ـــــ آج ریلوے کے بڑے بڑے افسروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ طے ہوا کہ ریل کے آخری ڈبے میں چونکہ جھٹکے بہت لگتے ہیں اس لیے آئندہ ریل میں آخری ڈبہ نہ لگایا جائے ـــــ دیکھا آپ نے، کیسی کارآمد خبر ہے۔ اب ریل میں آخری ڈبہ نہیں ہوا کرے گا۔"

"مگر ——"

"اچھا اور دوسری خبر یہ ہے کہ کولمبو میں علامہ ابوالہول صاحب نے تقریر فرماتے ہوئے فرمایا کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت کرے، اپنے وطن سے پیار کرے، خواہ وہ وہاں پیدا ہُوا ہو یا نہ پیدا ہُوا ہو۔"

"لیکن میرا امتحان ہے ——!"

"مجھے معلوم ہے۔ اور تیسری خبر یہ ہے۔ خبر کیا ہے اشتہار ہے۔ ایک صاحب کی گائے کھوئی گئی ہے۔ انہوں نے گائے کا حلیہ بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جو صاحب اس گائے کا اتا پتا بتائیں گے انہیں ایک عدد بچھڑا انعام میں دیا جائے گا۔ گائے اگر خود یہ اشتہار پڑھے یا کہیں سے سُن پائے تو بے تشک واپس چلی آئے۔ ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ اور بچھڑا بے حد اداس ہے۔ اس نے چار روز سے نہ کھانا کھایا ہے نہ چائے پی ہے۔"

"رضیہ ——!"

"چوتھی خبر یہ ہے —— پشاور —— کل یہاں ایک عجیب حادثہ ہوا جس سے سارے شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ پبلک بے چین ہے اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ صبح ایک بزرگ نے، جن کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی، سائیکل چلاتے ہوئے ایک بُڑھیا سے ٹکر ماردی۔ بُڑھیا بہت ناراض ہوئی اور ڈانٹنے لگی کہ شرم تو نہیں آتی ہو گی۔ اتنی لمبی ڈاڑھی لیے پھرتے ہو اور سائیکل بھی چلانی

نہیں آتی۔ ٹکریں مارتے پھرتے ہو۔ اس پر بزرگ نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ "بھائی! یہ ڈاڑھی ہے برکیں تھوڑا ہی ہیں۔"

میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اور جب رضیہ چلی گئی تو غور سے انگریزی کا ایک مضمون پڑھنے لگا جس میں لکھا تھا کہ حسین لڑکیاں ہمیشہ مہربان اور ہمدرد ہوتی ہیں۔ کس نالائق نے لکھا ہے یہ؟ میں نے کتاب بند کر دی اور دیر تک جاگتا رہا۔

رات کا وقت تھا اور موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ برآمدے میں جا بیٹھوں، بڑا لطف رہے گا۔ لیکن پھر امتحان کا ڈر اور ساتھ ہی یہ خیال بھی کہ اس وقت جتنا پڑھ سکتے ہو پڑھ لو، کیونکہ رضیہ کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہی سوچ رہا تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھلا اور رضیہ داخل ہوئی۔ ہاتھ میں کتابیں لیے اور پانی میں تر بتر۔

"آپ پڑھتے رہیے۔ میں آپ کا وقت ہرگز ضائع نہیں کروں گی میں تو بس ویسے ہی چلی آئی۔ چھٹیوں کا کام کرنا ہے۔ وہاں بچے شور مچا رہے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"آپ نے مالی کو کب دیکھا تھا؟"

"شام کو!" مَیں بدستور کتاب پڑھتا رہا۔

"اب کیا حال ہے بے چارے کا؟ کونین سے بخار اُترا گیا؟"

"ہاں بخار تو ٹوٹ گیا ہے لیکن کمر کا درد بدستور ہے۔"

"تو پھر کونین ہی جاری رکھیے۔ کل پرسوں تک کمر بھی ٹوٹ جائے گی!"

کچھ دیر کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔

"آپ ذرا میرا امتحان تو لے کر دیکھیے۔ یہ رہی سائنس کی کتاب۔ اِسے مَیں نے ابھی ابھی ختم کیا ہے۔ آپ اس میں سے کوئی سوال کیجیے۔"

مَیں نے کتاب لے لی اور ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک دوسری سے کس کس طرح مختلف ہیں؟"

"آج کل تو بالکل مختلف نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"سنا ہے کہ چند سال پہلے بڑے اختلاف تھے لیکن اب صلح ہو گئی ہے اور کوئی اختلاف نہیں رہا۔"

"تمھیں سائنس کون پڑھاتا ہے؟"

"استانی صاحبہ!"

"استانی صاحبہ کون ہیں؟"

"ایک عورت ہیں۔"

"عورت تو ہیں لیکن کیا یہی پڑھاتی ہیں وہ؟"

"جی نہیں، پڑھاتی تو وہ بہت کچھ ہیں، لیکن ہم دونوں کے خیالات مختلف ہیں۔"

"تم سکول کا کام کہاں کیا کرتی ہو؟"

"حسینہ کے ساتھ!"

"اور حسینہ کہاں پڑھتی ہے؟"

"میرے ساتھ!"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تم دونوں کہاں پڑھتی ہو؟"

"ہم دونوں اکھٹے پڑھتے ہیں۔"

"اچھا! مجھے اب پڑھنے دو۔" میں نے لیمپ اپنی طرف سرکا لیا۔

"اس لیمپ کو ذرا اس طرف کر دیجیے ہماری آنکھوں پر روشنی پڑتی ہے۔"

"بھئی! اب چپ بھی رہو۔ لیمپ یہیں رہے گا۔" میں نے منت سے کہا۔

اس نے فوراً کمرے کے سارے قمقمے روشن کر دیے اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

"رضیہ! روشنی کم کر دو آنکھیں چندھیاتی ہیں۔"

"آپ دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائیے۔ روشنی کم ہو جائے گی۔"

"ذرا دہ سگرٹ کا ڈبہ تو اٹھا دو۔"

"آپ فرض کر لیجیے کہ سگرٹ پی چکے ہیں۔"

"اچھا، ذرا باہر جا کر دیکھو تو سہی کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں؟"

"ابھی ہو رہی ہے۔"

"باہر جا کر دیکھو" میں نے ذرا رُعب سے کہا۔

"ابھی ابھی ایک بلّی باہر سے آئی ہے اور بیچاری بھیگی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو ہمیں پانی پلاؤ۔"

"اتنے کام تو میں نے کیے ہیں، پانی آپ خود اُٹھ کر پی آئیں۔"

اگلے روز سیدھا بیگم صاحبہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ لکھ رہی تھیں۔ رضیہ پاس بیٹھی گلدانوں میں پھول سجا رہی تھی۔

میں نے بیگم صاحبہ کو سلام کیا۔

وہ بولیں "جیتے رہو۔"

"بات یہ ہے کہ یہاں اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا اور امتحان نزدیک آگیا ہے۔ گنے گنائے دن رہ گئے ہیں۔"

"خوب! تو گویا مکمل تیاری ہو گئی ہے۔" وہ بدستور مصروف تھیں۔

"جی نہیں! ایک لفظ نہیں پڑھا۔ کمرے میں وہ دھما چوکڑی رہتی ہے کہ الاماں۔ بھلا شور غل میں کوئی پڑھ سکتا ہے؟"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" انہوں نے لکھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ سنتی تو ہیں نہیں۔ میں اجازت لینے آیا ہوں اور واپس ہوسٹل جانا چاہتا ہوں۔"

"ہوٹل —؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں، ہوسٹل" میں نے بتایا۔

رضیہ بولی "امّی یہ اجازت مانگ رہے ہیں۔ بھلا آپ انہیں بورسٹل جانے کی اجازت دے دیں گی کیا؟ یہ وہاں جانا چاہتے ہیں۔"

"بورسٹل! غضب خدا کا۔" بیگم کے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ "یہ کیا نئے نئے شوق اُٹھتے ہیں تم لڑکوں کے دل میں؟ توبہ توبہ، بورسٹل جانا چاہتا ہے یہ لڑکا!"

"اجی وہاں نہیں۔ دراصل میں جانا ضرور چاہتا ہوں لیکن —!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں لڑکے! عقل کے ناخن لے۔ اگر تیری امّی کو معلوم ہو گیا تو کیا کہیں گی؟ مجھے تو اب تک یقین نہیں آتا — کیا تو سچ مچ —؟"

"آپ سنتی تو ہیں ہی نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ —!"

"خاک عرض کیا تھا، دھول عرض کیا تھا۔ ہرگز نہیں، میں ایک نہ سنوں گی۔ تعجب ہے کہ تم سا عقلمند لڑکا ایسی باتیں کرنے لگے۔"

اور باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ جج صاحب آ رہے تھے۔ میں بھاگا اپنے کمرے کی طرف۔ اگر انہوں نے یہ قصّہ سُن لیا تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔

شام کو رضیہ صاحبہ تشریف لائیں۔ آسمانی رنگ کا لباس۔ ملگجا دوپٹہ اور ہلکی ہلکی خوشبو ــــ بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں بدستور ایک کتاب تھی۔

"صرف دس منٹ آپ مجھے دے دیجیے۔ یہ دیکھیے تاریخ کی کتاب ہے۔ میں نے اسے ابھی ابھی ختم کیا ہے۔ آپ سوال پوچھیے۔ پورے دس منٹ کے بعد میں چلی جاؤں گی۔"

میں نے کتاب لے لی۔

"اچھا جب بروٹس نے سیزر کو قتل کیا تو خنجر لگتے ہی سیزر کے منہ سے کیا الفاظ نکلے تھے ــــ؟" میں نے پوچھا۔

"سیزر نے اُچھل کر کہا تھا ــــ "آدُوچھ!""

"رچرڈ اوّل نے تخت حاصل کرنے کے بعد پہلا کام کیا کیا؟"

"وہ تخت پر بیٹھ گیا۔"

"اور ۱۶۴۸ء کا مشہور تاریخی واقعہ بیان کرو۔"

"پتا نہیں۔ آپ بتائیے کہ کیا ہُوا تھا؟"

"تم بتاؤ۔"

"چلیے اس مرتبہ آپ بتا دیجیے۔"

"روضۂ تاج محل مکمل ہوا تھا۔"

"خوب !"

"اور ۱۶۵۸ء میں کیا ہوا ؟"

"روضۂ تاج محل کو مکمل ہوئے دس سال گزر چکے تھے۔"

"اور ۱۷۴۸ء میں ؟"

"روضۂ تاج محل کو مکمل ہوئے پورے سو سال گزر چکے تھے !"

اور میں خاموش ہو گیا۔ سوچنے لگا اب کیا کروں۔

"رضیہ ! تم کہیں باہر جا رہی ہو کیا ؟"

"ہاں !"

"کہاں بھلا ؟"

"حسینہ کے ہاں !"

"اچھا تو یہ لو دو روپے۔ ایک کے چاکلیٹ اور ایک کی ٹافی لیتی آنا !"

"آپ بھی ساتھ چلیے۔"

"نہیں نہیں۔ آج میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔"

"تو پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اتنا سا امتحان ہی ہے نا، اور آپ نے اسے پہاڑ بنا رکھا ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوں تو ایک لفظ نہ پڑھوں۔ اور اگر آپ کا یہی حال رہا تو پاس ہونا تو در کنار آپ اچھی طرح فیل بھی

نہ ہو سکیں گے۔"

رضیہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پڑھنے بیٹھا۔ لیکن رضیہ کا جگمگاتا ہوا چہرہ آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔ وہ چمکیلے بُندے اور وہ مسکراتی ہوئی شریر آنکھیں۔ میں نے کتاب بند کر دی۔ صندوق میں سے رضیہ کی تصویریں نکالیں اور دیر تک دیکھتا رہا۔ میں اس دفعہ ضرور فیل ہو جاؤں گا۔ پھر چاروں طرف سے لعنت ملامت ہو گی۔ نہ کوئی کشمیر جانے دے گا نہ کہیں اور۔ استاد بھی خفا ہوں گے اور لڑکے بھی یہی کہیں گے کہ جناب کھیلوں کے ٹھیکیدار بن کر رہ گئے ہیں ـــــ پڑھائی میں صفر ہیں۔ لیکن کروں تو کیا کروں۔ عجیب مصیبت ہے۔ اگر یہ رضیہ یہاں نہ ہوتی تو خوب تیاری ہو جاتی اور ضرور پاس ہو جاتا۔

رضیہ واپس آئی، مگر خالی ہاتھ۔ سوچا کہ اب اسے ڈانٹیں، یہ ٹافی وغیرہ بھول آئی ہے۔

"وہ چاکلیٹ کہاں ہیں؟"

"اوہ! وہ تو میں نے نہیں خریدے۔ بھلا خریدتی کیونکر؟ آپ نے دو روپے تو دے دیئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سے روپے کی ٹافی لاؤں اور کون سے روپے کے چاکلیٹ۔"

اور اگلے روز مَیں جج صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔

"بیٹھو بچّے! کیسی تیّاری ہو رہی ہے؟" وہ بولے۔

"جی۔ یہاں بالکل پڑھائی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ مَیں باہر اچھی طرح پڑھ سکوں گا۔ اور مَیں چاہتا تھا کہ —— مَیں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔ مَیں جانا چاہتا ہوں —!"

"کتنی عجیب بات ہے۔" جج صاحب ناراض ہو کر بولے "جب بیگم نے مجھ سے کہا تو مجھے یقین نہ آیا۔ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا ہے؟ مجھے سچ مچ یقین نہیں آتا۔ آخر تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟ مجھے تم سے ہرگز یہ اُمّید نہ تھی —— سچ مچ —"

"لیکن یہاں میں ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اور اگر آپ اجازت دے دیں تو مَیں تو آج ہی ——"

"دیکھو برخوردار! مَیں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ مَیں تمہیں ہرگز بورسٹل میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا ——!"

"لیکن میری بات بھی تو سنیے ——!"

"مَیں کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز تمہاری صحت گرتی جا رہی ہے۔ غالبًا تم نے ورزش چھوڑ دی ہے۔ اسی لیے تمہارے دماغ میں ایسی ایسی باتیں آتی ہیں۔ کل سے تم گھوڑے کی سواری کیا کرو۔"

میں نے واپس آتے ہوئے دیکھا کہ رضیہ پردے کی اوٹ میں کھڑی جھانک رہی ہے۔ یہ گھوڑے کی مصیبت خواہ مخواہ مول لی۔ وہی ہوا ناز بخشوائے گئے تھے اور روزے سر منڈھ دیئے گئے۔ پھر جج صاحب کے گھوڑوں سے تو خدا بچائے۔ انہیں تو کسی طرح بھی گھوڑوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کٹکھنے ہیں۔ دولتیاں مارتے ہیں۔ فوراً نیچے پٹخ دیتے ہیں۔ بدتمیز بھی ہیں۔

رضیہ نے مجھے آلیا۔ بولی "تو آپ کل سے شہ سواری کیا کریں گے!"

"لیکن میں تو آپ کے گھوڑوں کے پاس بھی نہ پھٹکوں گا"

"میں بتاؤں! ایک نہایت شریف اور سیدھا سادہ گھوڑا میری نظر میں ہے"

"کہاں ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ویسے مفت نہیں ملے گا خریدنا پڑے گا"

"لیکن گھوڑا تو میں ہرگز نہیں خرید سکتا۔ آج کل گھوڑا تو کیا میں گدھا بھی نہیں خرید سکتا۔ میرا اسکالرشپ بھی ختم ہو چکا ہے اور جیب خرچ بھی"

"بہت سستا مل جائے گا"

"کتنے کا؟"

"یہی کوئی پچاس روپے کا"

"تو پھر ہو گا وہ کوئی سیکنڈ ہینڈ مریل گھوڑا"

"جی نہیں، نہایت مضبوط اور تیز رفتار گھوڑا۔ اس کا رنگ مشکی ہے۔ اس

نے بہت سی دوڑیں جیتی ہیں۔"

"تو پھر وہ ان دنوں بیمار ہو گا۔"

"نہیں تو۔"

"کانا ہو گا یا بھینگا ہو گا۔"

"نہیں!"

"تو پھر وہ لنگڑا تو ضرور ہی ہو گا۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تو کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہو گا اس میں۔"

"بس ایک معمولی سا نقص ہے۔"

"کیا؟"

"وہ گھوڑا ویسے تو بالکل ٹھیک ہے فقط ذرا ——!"

"ہاں ہاں فقط ذرا ——؟"

"ذرا مر گیا ہے۔"

جج صاحب کے کسی دوست کے ہاں تقریب تھی۔ ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ سب وہاں گئے۔ بڑی رونق تھی، کئی کنبے آئے ہوئے تھے۔ میں کچھ دیر تو

بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ پھر دیکھا کہ ہال کمرے میں گانا ہو رہا ہے۔ وہاں چلا گیا۔ کوئی صاحب پکے راگ گا رہے تھے۔ لوگ باری باری فرمائش کرتے اور گانوں کے نام لیتے تھے۔ مجھے بھی فرمائش کرنے کو کہا گیا۔ مجھے پکے گانوں کے نام بالکل نہیں آتے۔ فقط ایک نام بھیرویں یاد تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا —— "اچھا قبلہ تو ذرا ہو جائے بھیرویں۔"

انہوں نے ایک عجیب ہی سُر میں ایک عجیب سا راگ شروع کر دیا۔ میری نگاہیں پردے پر جم کر رہ گئیں جس کے پیچھے رضیہ کھڑی تھی۔ اب یہ ضرور کوئی شرارت کرے گی۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک گانا ختم ہو گیا۔

"کیوں حضرت پسند آیا؟" گویے نے میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

"جی میں نے بھیرویں کی درخواست کی تھی۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ بھیرویں ہی تو تھی۔"

"اوہ! اگر بھیرویں تھی تو واہ واہ، سبحان اللہ، مرحبا، کیا کہنے۔"

مجھے اندر بلا لیا گیا۔ چند خواتین مجھ سے ملنا چاہتی تھیں، ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک خاتون بولیں "کیوں بیٹا! یہ جو تالاب کے پاس پُرانی عمارت ہے یہ کتنی پرانی ہو گی؟"

"جی، یہ ایک ہزار برس پرانی ہے۔"

"جی نہیں، یہ ایک ہزار چار برس اور ساڑھے تین مہینے پرانی ہے۔" رضیہ

نے کہا۔

" یہ چار برس اور ساڑھے تین مہینے تم کہاں سے لے آئیں ؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

" جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سنا تھا کہ یہ عمارت ایک ہزار سال پُرانی ہے اور ہمیں یہاں آئے چار برس ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں ۔" رضیہ نے کہا۔

" سچ کہتی ہے بچّی ۔" وہی خاتون بولیں ۔" بڑی قابل معلوم ہوتی ہے۔ کون سی جماعت میں پڑھتی ہے ؟"

رضیہ کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ میں کچھ کھسیانا سا ہو کر باغ میں چلا آیا۔ جو دیکھتا ہوں تو سامنے سے رضیہ چلی آ رہی ہے۔

" ہمیں گھر لے چلیے ۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

" سب اکٹھے چلیں گے ۔"

" نہیں ہمارے سر میں درد ہے اور آپ کو بھی جا کر پڑھنا چاہیے ۔"

اس نے پڑھائی یاد دلا دی۔ واقعی مجھے پڑھنا بھی تو ہے۔

ہم دونوں واپس ہوئے اور کھانے کی میز پر اس طرح بیٹھے کہ ایک سرے پر میں تھا اور دوسرے پر رضیہ۔ نوکر نے کھانا چن دیا اور کچھ لینے باہر چلا گیا۔

"ذرا پانی تو پلائیے۔" رضیہ بولی۔

اور مجھے غصہ آگیا۔ خدا جانے اس لڑکی نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں اس سے کم از کم تین سال بڑا ہوں گا۔

"خود اٹھ کر پی لو۔"

"آپ ہی لا دیجیے۔ معمولی سا کام ہے۔ آپ تو ناحق تکلّف کرتے ہیں۔"

"میں ہرگز نہیں اُٹھوں گا۔ پینا ہے تو خود پی لو۔" میں نے جھلّا کر کہا۔

"اچھا میں آنکھیں بند کرتی ہوں اتنے میں آپ چپ چاپ لے آئیے۔"

"دیکھو رضیہ! اگر تم نے دوبارہ پانی وانی کا ذکر کیا تو میں —— تو میں آکر تمہارے کان کھینچ لوں گا۔"

"اچھا جب آپ کان کھینچنے آئیں تو ایک گلاس پانی لیتے آئیں۔"

اگلے روز میں پکچر دیکھنے گیا۔ پہلے سوچا تھا کہ رضیہ کو ساتھ لے چلیں۔ اتنی پیاری لڑکی ساتھ ہو تو ہم جماعتوں پر زبردست رُعب پڑتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہم جماعت تو سب کے سب امتحان کے پھیر میں ہیں اور رضیہ وہاں بھی تنگ کرے گی، چنانچہ میں چپ چاپ اکیلا ہی چلا گیا۔

ابھی تھوڑی سی فلم گزری ہو گی کہ کسی نے پچھلی سیٹ سے کہا۔ "ذرا بڈھے

ہو کر بیٹھے جناب! مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا"

میں سیدھا ہو گیا — پھر آواز آئی — "اپنے کان ذرا نیچے کر لیجیے اور گردن میں زور سے خم ڈال لیجیے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ سکوں"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا — ارے یہ تو رضیہ تھی!

"تم کیونکر آ گئیں؟"

"ہم چلنے پھرنے سے معذور ہیں یا ہمیں راستہ معلوم نہیں۔ یا ہمیں اکیلے آتے ڈر لگتا ہے"

"یہاں آ جاؤ" میں نے رسمی طور پر کہہ دیا اور وہ سچ مچ میرے ساتھ آ بیٹھی۔

اور جب ہم واپس جا رہے تھے تو شوفر نے پیچھے مڑ کر کہا "صاحب! پٹرول ختم ہو گیا ہے، راستے میں لے لوں کیا؟"

"لے لو" میں بولا۔

"سیدھے چلے چلو۔ رات کے وقت پٹرول کون پوچھتا ہے" رضیہ نے کہا۔

انہی دنوں ہمارے ہاں چند مہمان آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد سب کے سب باغ میں چبوترے پر بیٹھے تھے۔ رضیہ بھی موجود تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ اتنی دیر سے بالکل خاموش کیونکر ہے۔ میرے امتحان کا ذکر آیا تو رضیہ نے کہا "آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہ نہایت اچھے جواب مضمون لکھتے ہیں" جواب مضمون تو ایک طرف رہا میں نے کبھی سوال مضمون تک نہ لکھا تھا۔

"سچ مچ؟ ہم ضرور سنیں گے۔" مہمانوں میں سے کوئی بولے۔
"ان کا ایک تازہ جواب مضمون میرے پاس ہے۔"
"ضرور، ضرور!"
رضیہ اندر سے ایک کاپی اٹھا لائی۔
"ویسے یہ سارا جواب مضمون تو سنایا نہیں جا سکتا کیونکہ خاصا طویل ہے، البتہ اس کے چند حصے سناتی ہوں۔ ان سے آپ اندازہ کر لیجیے۔ سنیے ——
لکھتے ہیں کہ —— سورج مشرق میں غروب ہو رہا تھا۔ اچھی طرح غروب ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ غروب ہو کر پھر غوطہ لگا کر واپس اوپر آ جاتا۔ اسی طرح آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ میں نے غروبِ آفتاب کو غور سے دیکھا۔ سورج کو اٹھکیلیاں کرتے دیکھ کر مجھے سخت بھوک لگی۔ پھر میں نے سوچا کہ برا کیا چاہے دو آنکھیں ——"
"لاحول ولا قوۃ!" ایک طرف سے آواز آئی۔
"—— اور جب میں اندھیرے میں واپس آ رہا تھا تو مجھے ایک عزیز دوست ملا جس کے پاس ایک ٹارچ تھی۔ اس نے ٹارچ جلائی اور آسمان کی جانب رُخ کر دیا۔ فضا میں روشنی کی ایک لکیر بن گئی۔ وہ بولا تم بڑے سراغ رساں بنے پھرتے ہو جب جانیں کہ روشنی کی یہ لکیر پکڑ کر آسمان پر چڑھ جاؤ۔ میں کچھ دیر تو سوچتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا کسی اور کو بیوقوف بنانا۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم کیا کرو گے۔ جب میں یہ لکیر پکڑ کر اوپر چڑھ رہا ہوں گا تو تم ٹارچ

بجھا دو گے اور میں دھڑام سے نیچے آ گروں گا ——"

"بے حد زٹیل مضمون ہے بھئی! اسے مضمون کون کہہ سکتا ہے" آواز آئی۔

یہ تحریر میری نہیں تھی۔ کیا جانے رضیہ کیا پڑھ رہی تھی۔

"اچھّا اب ایک اور حصّہ سنیئے جس میں ہیرو ایک مجرم کا تعاقب کرتا ہے ——لکھتے ہیں —— جب میں نے اسے مکان سے نکلتے دیکھا تو فوراً اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میرے ساتھ میرا سراغرساں دوست بھی تھا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے کئی میل گئے۔ اس نے تانگہ کیا۔ ہم نے بھی تانگا کر لیا۔ وہ موٹر میں بیٹھ گیا۔ ہم بھی ایک اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ ہماری جیبوں میں بھرا ہُوا پستول اور ہتھکڑیاں تھیں اور وہ مجرم خالی ہاتھ تھا۔ خیر وہ سٹیشن پر پہنچا۔ ہم بھی پیچھے پیچھے سٹیشن پر پہنچے۔ ریل آئی۔ ہم ایک ہی ڈبّے میں سوار ہو گئے۔ ہماری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ دو دن اور دو رات ہم نے ٹرین میں اس کا پیچھا کیا۔ آخر وہ ایک جگہ اُتر گیا۔ ہم بھی ساتھ اُترے۔ اس نے جہاز کا رُخ کیا۔ ہم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر وہ جہاز میں سوار ہو کر چل دیا اور ہم سمندر کے کنارے سے اسے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔ پھر میں نے چونک کر اپنے دوست سے کہا کہ —— اگر ہم اسے گرفتار کر لیتے تو بہتر ہوتا۔ اس پر میرا دوست بولا۔ اوہ! خیال نہیں رہا ——"

"لاحول ولاقوۃ، یہ تو کچھ بھی نہیں بھئی! بڑا واہیات مضمون ہے۔"

"اور یہ ڈراما بھی کرتے ہیں۔ پچھلے سال انہوں نے ایک ڈراما کیا تھا جس میں ان کا پارٹ بالکل مختصر تھا۔ صرف سٹیج پر آ کر یہ کہنا تھا کہ یور ایکسیلینسی! ساٹھ کے کمرے میں ایک ساٹھ سال کا بوڑھا شخص بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ارشاد ہو تو حاضر کروں۔ اور اس فقرے کے لیے یہ کئی ہفتوں تک ریہرسل کرتے رہے۔ جب سٹیج پر آئے تو سب سے پہلے ان کی داہنی مونچھ گر پڑی جسے انہوں نے فوراً اٹھا کر لگا لیا۔ پھر یہ بڑی بلند آواز سے بولے۔ یور ایکسیلنسی! ساٹھ کے کمرے میں ایک بوڑھا شخص ساٹھ سال سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ارشاد ہو تو حاضر کروں ـــ اور تماشائیوں سے بہت سی آوازیں آئیں ـــ ضرور حاضر کیجیے ـــ ضرور بلائیے صاحب! ـــ"

"مَیں کالج کے ڈرامیٹک کلب کا سکرٹری ہوں۔" مَیں نے دبی زبان سے کہا۔

"جی ہاں! یہ ڈرامیٹک کلب کے جوائنٹ اسوشیئٹ اسسٹنٹ آنریری سکرٹری ہیں۔" رضیہ بولی۔

"مَیں نے ہمیشہ اہم ترین رول ادا کیے ہیں۔" مَیں نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہی کہ رومیو جولیٹ میں مَیں رومیو بنا تھا۔"

"اور داماق عذرا میں؟" رضیہ نے پوچھا۔

"وامق!"

"اور شیریں فرہاد میں؟"

"فرہاد!"

"اور فاتحِ بنگال ہیں؟"

"بنگال!" میرے منہ سے نکل گیا۔ اور جو قہقہے لگے ہیں تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اب امتحان میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ میری حالت عجیب سی تھی۔ غصہ بھی آتا تھا، افسوس بھی۔ اپنے اوپر ہنسی بھی آتی تھی۔ رضیہ سچ مچ میرے ساتھ زیادتی کر رہی تھی۔ سراسر زیادتی، اور وہ بھی اس حالت میں کہ میں بے بس تھا۔ بڑے غور و خوض کے بعد میں نے ایک تدبیر سوچی —— اپنا بٹوا دیکھا۔ کل چالیس روپے تھے۔ سیدھا بازار پہنچا۔ ایک دکاندار سے کہا کہ کوئی اچھا سا تحفہ دکھاؤ۔

"کسے دیجیے گا؟" سوال ہوا۔

"کسی کی طرف سے ہے، اپنے لیے۔"

"خاتون ہیں یا ——!"

"خاتون ہونی چاہئیں ——!"

"کیا لگتی ہیں آپ کی؟—— گستاخی معاف!"

"بالکل کچھ نہیں لگتیں ——"

"کیا عمر ہو گی اُن کی؟—— معاف کیجیے!"

"ہم عمر ہونی چاہئیں"

"اور وہ ——؟"

"جو تمہیں کہا ہے وہ کرو، سوال کرنا چھوڑ دو"

"تو صاحب اس صورت میں تو انگوٹھی سب سے اچھی رہے گی۔ میرے پاس بہت سی اعلیٰ درجے کی انگوٹھیاں ہیں —— یہ دیکھیے ——!"

مجھے ایک انگوٹھی پسند آگئی۔ نہایت خوبصورت تھی۔ قیمت دریافت کی تو معلوم ہوا پچاس روپے کی ہے۔ میں ہچکچانے لگا اور دوسری انگوٹھیوں کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ غالباً دکاندار بھانپ گیا۔

"کوئی خیال نہ کیجیے، باقی روپے پھر بھجوا دیجیے" اور میں انگوٹھی لے آیا۔

اگلے روز رضیہ نے میری انگلی میں انگوٹھی دیکھی۔ متعجّب ہو کر سوال کرتے کرتے رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں خود اسے بتاؤں گا۔

اس سے اگلے دن پھر یہی ہوا۔ وہ کنکھیوں سے انگوٹھی کی طرف دیکھتی رہی۔ میں خاموش رہا۔

نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور وہ کترانے لگی۔ پڑھائی بڑے زور شور سے شروع ہو گئی۔

مَیں بڑے مزے سے اپنی انگوٹھی کو پالش کر رہا تھا ـــــ اور وہ چپ چاپ میرے سامنے کھڑی تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ سچ مچ وہی رضیہ ہے۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ نظریں نیچی ہیں، سمٹی سمٹائی کھڑی ہے۔ عجیب تماشا ہے۔ کیسی عجیب لڑکی ہے!

"ارے! یہ تمہاری انگلی سے خون نکل رہا ہے" مَیں نے اسکی انگلی پکڑتے ہوئے کہا ـــــ "کہیں کانٹا چبھ گیا تھا کیا؟"

اس نے آہستہ سے ہاتھ جھٹک دیا اور بولی ـــــ "آپ کی بلا سے" چشم زدن میں رضیہ وہاں سے غائب تھی۔

"آپ کی بلا سے" ـــــ یہ الفاظ کس قدر شیریں لہجے میں کہے گئے تھے۔ کس قدر پیار، ملائمت اور ترنّم نمایاں ہیں۔

مَیں نے دہرایا ـــــ "آپ کی بلا سے"

رات بھر مَیں نے ایک لفظ نہ پڑھا نہ مجھے نیند ہی آئی ـــــ رات بھر میرے کانوں میں یہی ایک فقرہ گونجتا رہا۔ چاند نکلا۔ بلبل نے اپنا نغمہ چھیڑا۔ آواز آئی۔

"آپ کی بلا سے۔"

اور صبح میں امتحان کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ پرچہ میرے سامنے رکھا تھا جس میں چھ سوال تھے۔ ہر سوال کی عبارت یہ تھی ــــ آپ کی بلا سے ــــ آپ کی بلا سے ۔ میں نے خدا جانے پرچے میں کیا لکھا اور کیا نہیں لکھا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ایک فقرہ میں نے کئی جگہ لکھ دیا تھا۔ اور وہ فقرہ تھا۔ "آپ کی بلا سے۔"

اور جب میں واپس آیا تو رضیہ نے پوچھ ہی لیا۔ "یہ انگوٹھی کہاں سے ملی؟"

"کسی کا تحفہ ہے۔"

وہ دو تین دن کے لیے پھر غائب ہو گئی۔ پھر ایک روز اس نے پوچھا۔

"سنائیے انگوٹھی کا کیا حال ہے؟"

"خیریت سے ہے ــــ" میں نے جواب دیا۔

اگلے ہفتے میں کشمیر چلا گیا۔ چند روز تو انگوٹھی اور رضیہ دونوں کا خیال رہا۔ بعد میں سب کچھ بھول گیا۔

اور اب ــــ اس امتحان میں جبکہ میں بالکل اکیلا تھا اپنا وہ امتحان بہت یاد آیا۔ چند سال پہلے کا وہ امتحان۔ اور رضیہ بھی بہت یاد آئی۔ اب مجھے معلوم تھا کہ رضیہ نے اس تحفے کو اس قدر سنجیدگی سے کیوں لیا تھا۔

امتحان کے دنوں میں رضیہ نے بڑی شرارتیں کی تھیں۔ مجھے بہت چھیڑا

تھا، تنگ کیا تھا، خوب ستایا تھا۔ لیکن انگوٹھی کا فرضی تحفہ پہن کر
شاید میں نے بھی زیادتی کی تھی۔

ہماری فلمیں

ہماری فلموں سے مُراد وہ فلمیں ہیں جو ملکی ہیں۔ جن میں ہماری روزانہ زندگی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں جن میں ہماری برائیاں اور کمزوریاں بے نقاب کی جاتی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری فلموں نے اتنے تھوڑے سے عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ چند ہی سال کی بات ہے کہ یہاں نہایت مضحکہ خیز فلمیں بنتی تھیں جن کے خیال سے ہم شرمندہ ہو جاتے ہیں اور ہماری پیشانی پر پسینے کے پانچ چھ قطرے آجاتے ہیں۔ لیکن اب خدا کے فضل سے ایسی فلمیں بننے لگی ہیں جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ اب ڈنڈے مار فلموں کا زمانہ گیا۔ بادشاہوں کے محلوں اور سنیاسیوں کے غاروں سے اب کیمرے کا رُخ ایک معمولی خاندان کے گھر کی جانب ہو گیا ہے۔ اب ہماری فلمیں ہماری روزانہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ہم اس ترقی پر یقیناً بہت خوش

ہیں۔ بعض اوقات ہم تنہائی میں مسکرانے لگتے ہیں اور دیر تک مسکراتے رہتے ہیں۔ مسرت سے ہماری باچھیں کھل جاتی ہیں۔ فخر سے ہمارا سینہ تن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کبھی کبھی کچھ عجیب سے خیالات ہمارے دل میں آنے لگتے ہیں۔ ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ اس الجھن سے باہر نکل آئیں لیکن مجبور ہو کر الٹی سیدھی باتیں سوچنے بیٹھ جاتے ہیں۔

پہلے تو ہم اپنے پروڈیوسر حضرات کی دریادلی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں۔ ایک فلم خدا جانے کتنی لمبی ہوتی ہے۔ شاید کئی میل لمبی اور جب ٹریلر دیکھتے ہیں تو قریب قریب ساری فلمی کہانی سُن لیتے ہیں۔ ٹریلر کے بعد فلم دیکھنا محض اسے دُہرانا ہے۔

ایک اور بات جو ہمیں اپنی فلمیں دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جب محبت ہوتی ہو تو یوں منٹوں میں ہو جاتی ہے اور ایک ہفتے کے اندر اندر دونوں کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اب اس معاملے میں ہمیں کوئی ذاتی تجربہ تو ہے نہیں لیکن یہ ضرور سُنا ہے کہ اصلی محبت ہونے میں کم از کم چھ ماہ سے ایک سال تک کا عرصہ لگتا ہے۔

لیکن یہاں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ محبت کے لیے فقط ایک چیز ضروری ہے اور وہ ہے ایک لڑکے اور لڑکی کی ملاقات۔ شام کو اگر لڑکا سینما گیا تو لڑکی ضرور وہیں ملے گی اور اگر لڑکی سرکس گئی تو لڑکا ضرور وہیں ہو گا۔

اگلے روز لڑکے کو تار ملے گا کہ فوراً گھر پہنچو۔ ریل کے ڈبے میں بیٹھتے ہی اسے پتا چلے گا کہ اتفاق سے لڑکی بھی اسی ڈبے میں بیٹھی ہے۔ راستے میں ان کے صندوق بدل جائیں گے۔ پھر ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو لڑکا وہیں کہیں کسی آفت سے بچالے گا اور وہ شخص لازماً اسی لڑکی کا والد ہوگا۔ اور جب لڑکی کے والد تک معاملہ پہنچ جائے تو سمجھ لیجیے کہ اب شادی ہوکر رہے گی۔ اس قسم کے حادثات ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ دونوں کی شادی ہوجائے گی۔ شادی کے بعد حادثے بالکل بند ہوجائیں گے اور دنیا میں سکون آجائے گا۔

ساتھ ہی ایک اور گہرے راز کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ اس ملک میں وہی شخص محبّت کرسکتا ہے جو بہت اچھا گاتا ہو۔ جسے گانا نہ آتا ہو اس شخص کو اتنا سا بھی حق حاصل نہیں کہ محبّت کے متعلق کچھ سوچے بھی۔ البتہ وہ کوشش کرے تو وِلّین کا کام کرسکتا ہے۔ دو محبّت کے متوالے دلوں کے بیچ میں ٹانگ اڑا سکتا ہے۔ بس!

اب سوچیے تو سہی کہ ایک حسین خاتون (جن سے آپ محبت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں) ایک تتلی یا پھول کو دیکھ کر یا یونہی خواہ مخواہ اتنی خوش ہوجاتی ہیں کہ فوراً فی البدیہہ نظم کہہ کر اسے گانے لگتی ہے۔ لازماً آپ کو کسی درخت کی آڑ میں وکٹ کیپر کی طرح جھکے ہوئے تاک لگائے کھڑا ہونا چاہیے۔ تو اس وقت آپ کا پریم تبھی ظاہر ہوگا کہ آپ ایک ہاتھ لہرا کر نعرہ لگائیں اور گانا

شروع کردیں۔

اور آپ ان کے گاتے ہی فوراً کسی جھاڑی کے پیچھے سے نکل نہیں آتے یا کسی درخت سے دھم سے کود نہیں پڑتے، اور اگر آپ فی البدیہہ اشعار نہیں کہہ سکتے اور فوراً ہی دوگانے میں شامل نہیں ہو سکتے تو خاطر جمع رکھیے کہ آپ ہرگز ہرگز پریم کے حق دار نہیں۔

آپ کو چاہیے کہ چوبیس گھنٹے ان کی کوٹھی کا پہرہ دیں اور اسی تاک میں رہیں کہ وہ خاتون کس وقت اپنے کمرے میں یا اپنے باغ میں یا باورچی خانے میں یا سیڑھیوں پر خوش ہو کر گانا شروع کرتی ہیں۔ بس یہ سنہری موقع ہے۔ آپ بلند آواز سے جواباً گانا شروع کر دیجیے۔ چاند پر ایک بدلی آ جائے گی بلبلیں چہچہانے لگیں (اگر وہ سوئی پڑی ہیں تو انہیں اٹھنا پڑے گا)۔ ان خاتون کے گھر کے تمام افراد کے کانوں پر مہریں لگ جائیں گی۔ سب کے سب اس وقت تک بہرے رہیں گے جب تک آپ دونوں گانے کا شغل ختم نہیں کرتے۔

اگر وہ لوگ چونکیں گے تو آپ کے گانے سے نہیں بلکہ آپ کی سرگوشیوں سے۔ یا اگر آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ان کی یاد میں گا رہے ہیں (بلکہ رو رہے ہیں) تو آپ کا نوکر کمرے میں چائے لائے گا اور چپ چاپ واپس چلا جائے گا۔ باہر جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔ آپ کا پیارا

کتا فرش پر بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا ہو گا۔ باہر ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے غمگین پرندے چٹاخ پٹاخ زمین پر گرتے ہوں گے اور گرتے ہی دم نکل جاتا ہو گا۔

دیکھتے دیکھتے بادل اُمڈ آئیں گے۔ بجلیاں کوندنے لگیں گی۔ یک لخت موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور آپ کا جنون دُگنا ہو جائے گا۔ آپ یکایک چلّا چلّا کر گانا شروع کر دیں گے۔ پھر یک لخت ایک فلک شگاف دھماکہ ہو گا۔ سب سہم کر رہ جائیں گے۔ ایک سادھو بارش میں بھیگتا ہوا مستانہ آواز میں گاتا جا رہا ہو گا۔ آپ اسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگیں گے۔ آپ کے سامنے آکر تو وہ بالکل ہی آہستہ چلنے لگے گا۔ اس کی کوشش یہی ہو گی کہ کسی طرح وہ گانا پورا کر دے۔ جب تک وہ گاتا رہے گا بجلیاں نہیں کڑکیں گی۔ بارش بھی دھیمی پڑ جائے گی۔ جونہی اس نے گانا ختم کیا ایک دم بادل گھر آئیں گے۔ گرج اور کڑک پھر شروع ہو جائے گی اور سینما ہال میں بے شمار بچّے رونے لگیں گے۔

اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے ہاں وِلین سے بہت بے انصافی کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہال کا ہال لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔ ذرا ولین نظر آیا اور اگلی سیٹوں سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔

"مارو خبیث کو —!"

"ناہنجار، بدبخت! — فلاں کا پٹھا — بدتمیز۔!"

"ہاتھ پاؤں توڑ ڈالو کم بخت کے!"

دراصل ہمیں ولین ایک نہایت ڈراؤنی چیز دکھائی جاتی ہے جس میں دنیا بھر کے عیب ہوتے ہیں۔ اور ولین کا ہوّا لوگوں کے دلوں میں اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ فلم میں ولین بالکل نہ ہو۔ فقط ہیرو ہیروئن ہوں۔ ان کے والدین، ایک دو مسخرے اور چند نیک چال چلن والے آدمی ہوں۔ بس اب جب ولین کی مرمّت ہوتی ہے تو ہر شخص کا دل مسرّت سے رقص کرنے لگتا ہے۔ اِدھر ولین کیا مجال جو ذرا سی بھی مدافعت پیش کرتا ہو۔ ہٹّا کٹّا ولین ایک مرے ہوئے ہیرو سے مار کھاتا ہے۔

پرندوں کا ایک جوڑا بھی عرصے سے ہمارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔ آندھی ہو، طوفان ہو، بجلیاں کڑکیں، اولے پڑیں، پرندوں کا کم از کم ایک جوڑا ضرور ٹہنی سے چپکا ہوا ہوگا۔ دونوں پرندے ایک دوسرے کو پیار کر رہے ہوں گے اور دل ہی دل میں قدرت کے ان ڈراؤں پر ہنس رہے ہوں گے کہ یہ کیا چھچھوری کوششیں ہمیں اڑانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔

اور اسی موقع پر وہیں ہیرو اور ہیروئن بارش میں کھڑے بھیگ رہے ہوں گے۔ ان کے نزدیک گھنے درخت بھی ہوں گے، کوئی دالان بھی ہوگا لیکن بس بھیگنا جو

ہوا۔ دالان میں کھڑے ہو کر تو ہر کوئی محبّت کر سکتا ہے۔ مزہ ہے کہ محبّت بارش میں بھیگ کر کی جائے۔ پھر کہیں پرندوں کا جوڑا بھی ٹہنی پر بیٹھا بھیگ رہا ہو تو زہے قسمت۔

اگر ہیروئن اکیلی کھڑی بھیگ رہی ہے تو وہ ضرور بھاگے گی۔ اور ہیروئن ایسے موقع پر سیدھی کبھی نہیں بھاگتی۔ ہمیشہ لمبے سے لمبا اور مشکل ترین راستہ اختیار کرے گی۔ راستے سے دور کوئی درخت کھڑا ہے تو یہ ضرور دوڑ کر اس میں ٹکر مارے گی۔ اگر ٹھوکر کے لیے پتھر نہیں ملتا تو تلاش کر کے کوئی پتھر ضرور ڈھونڈے گی اور دھڑام سے نیچے گر پڑے گی۔

ادھر لوگوں کو شروع سے آخر تک یہی انتظار رہتا ہے کہ ان کی شادی کب ہوتی ہے۔ ہیرو ہیروئن کی، استاد استانی کی، ہیرو کے دوست اور ہیروئن کی سہیلی کی۔

بیچ میں مشکلات آتی ہیں مصیبتیں ٹوٹتی ہیں لیکن شادی کا پروگرام ہرگز نہیں بدل سکتا۔ اگر ہیرو آسٹریلیا چلا گیا اور ہیروئن تبت چلی گئی' اور دُور کہیں پہاڑوں میں چھپ کر جوگن بن گئی تو بھی دنیا کی کوئی طاقت انہیں شادی کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کسی نہ کسی دن ایک ہوائی جہاز آئے گا جس میں ہیرو بیٹھا ہو گا۔ اور اس ہوائی جہاز کا پٹرول عین اسی پہاڑ پر ختم ہو گا جہاں ہیروئن بیٹھی پُوجا کر رہی ہو گی۔ ہوائی جہاز دھڑام سے گرے گا۔

باقی سب اِنّا للہ ہو جائیں گے فقط ہیرو بچ جائے گا اور شادی ہو جائے گی۔
ہمارے ہاں کبھی کبھی ٹریجیڈی بھی دکھائی جاتی ہے۔ اور اس میں یہ ہوتا ہے
کہ یا تو ہیروئن کے ابّا کا انتقال ہو جاتا ہے' ہیرو کی جان بچاتے ہوئے۔ یا
ہیرو کی محبوبہ نمبر دو ہلاک ہو جاتی ہے' وہ بھی ہیرو کی جان بچاتے ہوئے۔ کیونکہ
ہیرو کا زندہ رہنا تو فلم کی جان ہے۔ یا یوں کہ ہیرو ہیروئن میں سے شادی
کے وقت ایک رحلت کر جاتا ہے۔ عموماً ہیروئن —— کیونکہ اس کی صحت
محبت کرتے کرتے کمزور ہو جاتی ہے۔ پھر ہیرو چیخیں مارتا ہے۔ پتھروں اور
درختوں سے دل کی باتیں کہتا ہے۔ بطخوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے باتیں کرتا ہے۔
بکریوں کے سامنے روتا ہے۔ اونٹوں کی قطار دیکھ کر وہ بے اوسان ہو جاتا
ہے اور ہیروئن کو یاد کرتا ہُوا ریگستان میں نکل جاتا ہے۔

پھر اتنے میں ایک سادھو (جو دیر سے انتظار میں بیٹھا ہے) ایک دردناک
گانا گاتا ہوا ایک جھیل کے سامنے سے گزرتا ہے۔ جھیل میں اس کا سایہ پڑ
رہا ہے۔ دور کہیں سورج غروب ہو رہا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے
ہیں۔ ہاتھ پاؤں میں تشنّج پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک بات کی تسلی رہتی ہے — آخر شادی تک نوبت تو پہنچ گئی تھی نا۔

ایکٹروں کی صحت کے متعلق ہمیں بڑا فکر رہتا ہے۔ ہمارے ڈائریکٹر حضرات بیحد انتہا پسند ہیں۔ یا تو ہمیں تپ دق کے مارے ہیرو دکھائے جاتے ہیں یا ایسے جیسے بورا رکھا ہو۔ اب ان دونوں قسم کے حضرات کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت کے پاس بھی پھٹکیں۔

سینما دیکھتے وقت محبت کے متعلق ہمارے خیالات بڑے لطیف ہوتے ہیں اور ذرا سی ناگوار بات سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک بھاری بھرکم گینڈے کو ہیرو کے روپ میں دیکھیں جو ایک موٹی تازی ہیروئن سے عشق کا دعویٰ رکھتا ہو تو لازماً افسوس ہوگا۔

ہیرو صاحب ہیروئن کے کمرے میں کھڑے بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں —— ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ ہم سماج کو کچل دیں گے۔ دنیا اگر ہم پر ہنستی ہے تو بیشک ہنسے۔ ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے —— ساتھ ساتھ وہ اپنی توخیز توند پر ہاتھ پھیرتے جاتے ہیں تو اس وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ شخص سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔

عجیب سی بات ہے کہ لوگ موٹے تازے آدمیوں کو محبت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ تصور میں لا ہی نہیں سکتے کہ ایک انسان جس کا وزن اڑھائی من سے زیادہ ہو جس کی دو ٹھوڑیاں ہوں جس کی توند طلوع ہو رہی ہو اس کے دل میں بھی محبت کا جذبہ سما سکتا ہے۔ عموماً یہی سوچا جاتا ہے کہ اس سائز

اور اس نمبر کے آدمی ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔
اسی طرح تپ دق کے مارے ہوئے ہیرو بھی دواؤں کے متعلق سوچتے ہوں گے۔
اسی زد میں عورتیں بھی آسکتی ہیں۔ چنانچہ ایک فربہ خاتون کو سریلی آواز میں
دردناک گانا گاتے دیکھ کر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے اور دل میں یہی
خیال آتا ہے کہ اب یہ گانا گا کر فوراً ایک بھاری سا ناشتا تناول فرمائیں گی
اور چند ڈکاریں لینے کے بعد مزے سے سو جائیں گی۔ اٹھیں گی تو پھر کھائیں گی۔
اور انہیں موٹاپے کے علاوہ فقط دو شوق ہیں ـــــ میک اپ کرنے اور
خوشنما کپڑے پہننے کا اور تصویریں کھچوانے کا۔

بعض اوقات ہمارے دل میں غم و غصّے کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہم سوچنے
لگتے ہیں کہ آخر کیوں ہمیں متناسب جسم والے ایکٹر نہیں دکھائے جاتے؟ اچھی
صحت والی خوبصورت ہیروئن اور تندرست بچّے۔ یہ سب کہاں ہیں؟
کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ لمبے لمبے بالوں والے لوفر، گلگلے
جیسی ہیروئن اور بسورتے ہوئے بچّے دیکھیں۔ اگر یہی ہے تو ہمیں اپنے
ساتھ ہمدردی ہے۔

اب رہ گیا فلموں کی لڑائی کا سین ـــ سو ایک بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی،

وہ یہ کہ ہمارے ہیرو ولین کو محض دھکیل ہی کیوں دیتے ہیں۔ سائنٹفک طریقے سے مکّا کیوں نہیں مارتے؟ اگر انہیں ولین کے جذبات کا بہت خیال رہتا ہے تو پھر دھکیلنا بھی فضول ہے۔ کچھ بھی نہ کہا کریں۔ ایک بڑا دہشت ناک سین ہے۔ ایک طرف ہیروئن بھیگی بلّی بنی کھڑی ہے۔ اس کے سامنے ولین کھڑا اسے دھمکا رہا ہے۔ ہیرو آجاتا ہے (وہ عموماً مصیبت کے وقت آجایا کرتا ہے، اس کی عادت ہے) یہ دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ لوگ مشتاق ہیں کہ دیکھیے اب ولین کا کیا حال ہوگا۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہیرو آگے بڑھ کر ولین کو ایک طرف دھکیل دیتا ہے تو ان کی تمام امنگوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

اُدھر ولین اِس صدمے سے اس قدر نڈھال ہو جاتا ہے کہ اُٹھ نہیں سکتا۔ نہ وہ ہیرو سے لڑنے کی جُرأت کر سکتا ہے۔ بس وہیں چپ چاپ لیٹا رہتا ہے۔ یا چپکے سے باہر چلا جاتا ہے۔

اور اگر لڑائی ہوتی بھی ہے تو یوں کہ ادھر سے ہیرو دھکیلنا شروع کرتا ہے تو ولین کو دوسری دیوار تک لے جاتا ہے۔ پھر اس کی باری آتی ہے اور وہ دھکیلتا دھکیلتا ہیرو کو اِدھر لے آتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کے سب منتظر ہوتے ہیں۔

بعض اوقات ایک اور قسم کی لڑائی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک جگہ بہت

سے آدمی کھڑے ہیں۔ یکایک سب کے سب پستول نکال لیتے ہیں۔ ہیرو ولین کو نشانہ بناتا ہے۔ ولین فوراً ہیرو کی طرف پستول کا رخ کر دیتا ہے۔ وہ گھوڑا تو دباتا ہے لیکن گولی ہیرو کے برابر سے نکل جاتی ہے اور ایک اور شخص خواہ مخواہ مر جاتا ہے۔ ولین گرتے گرتے ہیروئن کے چچیرے بھائی کو مار ڈالتا ہے اور وہ کسی اور کو۔ ہیروئن بھی کئی حضرات کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اس کے بعد جو دھما دھم ہوتی ہے تو چاروں طرف دھواں ہی دھواں چھا جاتا ہے اور جب مطلع صاف ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہیرو اور ہیروئن زندہ کھڑے ہیں اور باقی سب لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

ویسے کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہیروئن نمبر دو ہیرو کی جان بچانے کے سلسلے میں ہلاک ہو جاتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ہیرو شادی کسی اور سے کریگا۔

ڈاکٹر، وکیل اور تھانیدار یہ سب ہماری فلموں کی جان ہیں۔ جس فلم میں ایک آپریشن، ایک عدالت کا سین اور ایک گرفتاری عمل میں نہیں لائی جاتی اسے بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔

لیکن فلموں کا ڈاکٹر آل راؤنڈر ہوتا ہے یعنی ہاتھ میں نشتر، گلے میں ربڑ کی نلکی، سر پہ ہیڈ مرر اور دیوار پر بینائی ٹسٹ کرنے کے حروف۔ پتہ نہیں یہ سب چیزیں ایک ہی شخص ایک ہی کمرے میں کیونکر استعمال کر سکتا ہے اور ڈاکٹر کا محبوب فقرہ یہ ہے:

"حالت نازک ہے۔ دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ اگر ایسا ہی صدمہ دوبارہ پہنچایا جا سکے تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے یا ہو جائیں گی۔" اس کے بعد ڈاکٹر دماغ کا آپریشن کرنے سے بھی نہیں چُوکتا۔ ایسا آپریشن جو بڑے بڑے تجربہ کار سرجن نہیں کر سکتے۔

ایک خطرے سے ہم آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اگر فلم میں کوئی ایسا سین آ جائے جہاں فضا میں سکون ہو۔ ایکٹر بولتے بولتے دفعتاً خاموش ہو جائیں۔ کوئی خوشخبری سُنا دے یا بہت بُری خبر لے آئے۔ دو پرندے (ہمارے پرانے دوست) بیٹھے ہوں۔ سورج نکل رہا ہو یا ڈوب رہا ہو اور ہوا چل رہی ہو، تو سمجھ لیجیے کہ ضرور کوئی نہ کوئی گائے گا۔ کسی نہ کسی ایکٹر کو بیٹھے بٹھائے دورہ اٹھے گا اور دیکھتے دیکھتے وہ آپے سے باہر ہو جائے گا۔ اس وقت دنیا کی کوئی طاقت اسے گانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اور کچھ نہیں تو فوراً وہی ہمارا دیرینہ رفیق ایک سادھو گاتا ہوا سامنے سے گزر جائیگا۔

اور یہ لاٹری کی علت بھی سچ سچ سمجھ میں نہیں آئی۔ فلم میں جہاں کہیں ہیرو لاٹری کا ٹکٹ لے لے بس فوراً سمجھ لیجیے کہ یہ تین چار لاکھ یوں وصول کر لے گا۔ یہ یک طرفہ کارروائی ہمیں بالکل پسند نہیں۔

یا تو یوں ہو کہ فلم کے تمام ایکٹروں کو لاٹری کے ٹکٹ خریدتے دکھایا جائے۔ پھر کسی ایک کے نام انعام نکل آئے تو کوئی بات بھی ہوئی۔

لیکن جو سب سے غریب ہوتا ہے اسے کوئی مجبور کر کے ایک ٹکٹ دلوا دیتا ہے۔ یک لخت وہ امیر ہو جاتا ہے اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر بمبئی یا لاہور بھاگ جاتا ہے۔ وہاں سارا روپیہ خرچ کر کے پاگل یا کانا ہو کر واپس آجاتا ہے۔ آتے ہی اس کی بیوی فوراً اسے معاف کر دیتی ہے۔ ایک ڈاکٹر آپریشن کر کے اس کا دماغ یا آنکھیں درست کر دیتا ہے اور جہاں سے یہ قصّہ شروع ہوا تھا وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

اور زمینداروں کے متعلق لگاتار فلمیں دیکھ دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ زمیندار ایک نہایت رومانی ہستی ہے جس کا کام صبح سے شام تک شعر و شاعری اور محبت کرنا ہے۔ کپاس کے کھیتوں میں عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں۔ چرواہے بیلوں اور بھینسوں کے پاس بیٹھ کر محبوب کی یاد میں بانسری بجاتے ہیں۔ ہر ہل چلانے والا ایک زبردست گویّا ہوتا ہے جو چوبیس گھنٹے گاتا ہی رہتا ہے۔ ہر زمیندار کے لڑکے کا فرض ہے کہ وہ ضرور کسی سے محبت کرے اور زمیندار کا فرض ہے کہ وہ پہلے تو رسماً خفگی ظاہر کرے۔ پھر شادی پر رضامند ہو جائے۔ لیکن ہمارے ایک زمیندار دوست نے جب ہمیں اپنے مربعوں پر مدعو کیا اور ہم ایک عرصے تک ان کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی مشکوک بات برآمد نہ کر سکے تو ہمیں بے حد مایوسی ہوئی۔

ہیروئن کی شادی ہو رہی ہے، لیکن غلط آدمی کے ساتھ۔ ہیرو یا تو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے یا کسی اور جگہ ہے۔ لوگ بے چین ہیں۔ ولین بڑا خوش ہے ہیروئن رو رہی ہے (بعض اوقات ایسے موقعوں پر ہیروئن گانے سے بھی نہیں چوکتی) یک لخت ایک آدمی دوڑتا ہوا آتا ہے اور چلّا کر کہتا ہے۔ "ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی!" اس کے پیچھے پیچھے پولیس کا ایک افسر اور چند سپاہی ہیں جو فوراً ولین کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے "میں بے قصور ہوں!" جواب ملتا ہے کہ یہ عدالت میں کہنا۔

عموماً ہیرو پولیس کے ساتھ آیا کرتا ہے لیکن بعض اوقات اِدھر اُدھر سے بھی برآمد ہو جاتا ہے۔ ہیروئن کے ابّا اسے اشارہ کر دیتے ہیں کہ جلد ہاتھ منہ دھو کر آجاؤ۔

اِدھر جو براتی ولین کے ساتھ آئے تھے وہ سوچتے ہیں کہ چلو شادی ہی ہونی تھی، خواہ کسی کی ہو۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

پھر رومن وقتوں کا سین دکھایا جا رہا ہے۔ چند لوگوں نے رومن لباس پہن رکھا ہے۔ باقیوں نے نیکریں اور پتلونیں پہن رکھی ہیں۔ چند حضرات چھتریاں لگائے پھر رہے ہیں۔ ایک محراب میں سے کچھ اونٹ چلے جا رہے

ہیں۔ایک صاحب کے بال انگریزی تراش کے ہیں۔ ذرا غور کرنے پر کسی بازار میں بجلی کا کھمبا کسی مکان پر کبوتروں کی چھتری اور کسی درخت کی آڑ میں مسجد کا مینار ضرور مل جائے گا۔ یا یوں کہ سن انیس سو ایک کا واقعہ دکھایا جا رہا ہے اور دیوار پر کیلنڈر لگا ہوا ہے سن انیس سو بیالیس کا۔

بغداد کا سین ہے۔ وزیر اپنی عجیب و غریب پوشاک میں سرکس کا مسخرہ نظر آرہا ہے۔ ویلن نے پرانے یورپی سورماؤں کا لباس پہن رکھا ہے۔ ہیرو اپنی ایک گز لمبے پھندنے والی ٹوپی کے باوجود مغربی انداز سے ہیروئن کا ہاتھ چومتا ہے پہلے ہیروئن کے ابا کا مال چراتا ہے' پھر وہیں بڑے اطمینان سے نماز پڑھتا ہے۔ چار ساڑھے چار فٹ لمبی (اور ساڑھے چار فٹ چوڑی) ہیروئن دن رات بیش قیمت کپڑے اور زیور پہن کر مسہری پر پڑی رہتی ہے۔ کبھی چونکتی ہے تو تماشائیوں کی تفریح طبع اور ریکارڈوں کی فروخت کے سلسلے میں گانا گاتی ہے (جسے کوئی پلے بیک سنگر پہلے ہی گا چکی ہے)۔

ویسے بغداد کے آس پاس کوئی پہاڑ نہیں لیکن فلمی ڈاکو پہاڑی غاروں میں تو رہتے ہیں اور بادشاہ فقط بیس پچیس آدمیوں کے سامنے دیوانِ عام منعقد کرتا ہے۔

فرہاد صاحب نہایت درد ناک لہجے میں گا رہے ہیں۔ لوگ الف لیلوی سٹائل کے کپڑے پہنے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اتنے میں دُور ایک سڑک پر

چمکیلی سی کار گزر جاتی ہے۔ مہابھارت کے زمانے کی ہیروئن کی کلائی پر اتفاق سے گھڑی بندھی ہوئی ہے اور اس کے بال پرم کیے ہوئے ہیں۔

اگر کوئی ایکٹر کسی ایکٹر سے کسی راز کی اصلیت پوچھنا چاہے کہ اب تو بتا دو وہ بات کیا ہے؟ (یا کیا تھی) اور دوسرا ایکٹر کہے" ذرا ٹھہرو، ابھی بتاتا ہوں" یا" ذرا سے انتظار کے بعد سب کچھ معلوم ہو جائے گا" تو سمجھ لیجیے کہ اُس ایکٹر کا مطلب ہے کہ" میاں ابھی جلدی کیا ہے۔ ذرا دو تین ریل اور گزر جانے دو پھر بتائیں گے۔ اگر جلد جلد باتیں بتائی گئیں تو فلم چھوٹی سی رہ جائے گی"

اب آخر میں ہم چند پُراسرار باتوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے لیے معمّوں سے کم نہیں۔ ہم چاہیں جتنا سوچیں لیکن ان گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتے۔ مثلاً جب ہیرو ایک برس تک جنگل میں رہتا ہے جہاں اس کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔ کھانے کے لیے بندروں سے دھینگا مشتی کر کے پھل مہیّا کرتا ہے تو ہر روز علی الصبح اس کی حجامت کون کر جاتا ہے؟ جب وہ صبح صبح اٹھ کر تیرتا ہے تو اس کا چہرہ آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے۔ اسی طرح ہیروئن بار بار اتنی پھُرتی سے لباس کیونکر بدل لیتی ہے۔ وہ ہر سین میں نیا لباس پہن کر آتی ہے۔

پھر یہ کہ جب کبھی پندرہ یا سولہ برس گزرتے دکھائے جاتے ہیں۔ ایک دھندسی پردے پر آجاتی ہے۔ سین بدلنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے طویل عرصے نے کسی ایکٹر کی صحت پر ذرا سا بھی اثر نہیں کیا۔ ہیرو پہلے سے بھی زیادہ چست ہے۔ ہیروئن پہلے سے کہیں چاق چوبند اور موٹی ہے۔ ان کے والدین بھی ہو بہو ویسے ہی ہیں۔ بلکہ پہلے سے کچھ تندرست ہی ہیں۔ یہ سین دیکھ کر ہم سوچتے رہتے ہیں کہ ان لوگوں نے پندرہ سال تک وہ کون سا ٹانک استعمال کیا ہوگا۔ کاش ایسے وقت اس ٹانک کا نام بھی بتا دیا جائے۔

اور یہ کہ جب کردار خودکشی کرنے جاتے ہیں تو چپ چاپ کیوں نہیں جاتے۔ گاتے ہوئے کیوں جاتے ہیں؟ اور ایک خاتون جو آٹھ دس برس سے ہیرو پر مفتون ہیں یک لخت کسی اور خاتون کو ہیرو کے ساتھ دیکھ کر اپنے حقوق کیوں بخش دیتی ہیں؟ اور ساتھ ہی یہ کیوں فرما دیتی ہیں کہ آج سے ہیرو ان کا بھائی ہے۔ اسی طرح ہیرو بعض اوقات اچھی بھلی محبوبہ کو بہن کیوں بنا ڈالتا ہے؟

آخر میں ہم پھر عرض کیے دیتے ہیں کہ ہم اپنی فلموں کی حیرت انگیز ترقی پہ بڑے مسرور ہیں۔ ہمیں ان پر فخر ہے بعض اوقات ہم مغرور بھی ہو جاتے ہیں اور دیر تک مغرور رہتے ہیں۔ اور یہ جو بعض اوقات ہمارے دل میں عجیب سے خیالات آنے لگتے ہیں، بالکل عارضی ہوتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد بخارات بن کر اڑ جاتے ہیں۔ اور ہم پھر اپنی فلموں کے دلکش تصوّر میں کھو جاتے ہیں۔

شکائتیں

رات کے نو بجے ہوں گے۔ ایک لمبے سے کمرے میں ایک لڑکا کرسی پر بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔ دور کونے میں ایک لڑکی بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ ایک طرف دو پلنگ بچھے ہیں جن پر دو بچے لیٹے ہوئے ہیں۔

نعیم۔ (رضائی میں سے سر نکال کر) آپا ستارہ! تم سوال کیوں نہیں نکالتیں؟

ستارہ۔ (تکیے پر کہنی رکھ کر) شیطان کہیں کا! بڑوں کا نام لیا کرتے ہیں کہیں؟

نعیم۔ اور امّی جو ہر وقت تمہیں ستارہ ستارہ کہتی رہتی ہیں۔

ستارہ۔ ان کا کیا ہے، وہ تو بڑی ہیں۔ خیر، کچھ بھی ہو تجھے کیا؟

نعیم۔ کل امّی جان کہہ رہی تھیں، استانی نے آپ کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے کہ ستارہ حساب میں بہت کمزور ہے۔

ستارہ۔ پھر وہی نام لیا۔ تو جغرافیہ کیوں نہیں پڑھتا؟ فیل ہو کر دھرا جائے گا۔

جب دیکھو ڈنیگے لگاتا پھرتا ہے۔ جبھی تو پندرہ پندرہ نمبر آتے ہیں ہر مضمون میں۔ ہر مرتبہ سکول سے خراب رپورٹ آتی ہے۔

نعیم۔ امّی کہہ رہی تھیں کہ تم دونوں کے لیے ایک استاد رکھوں گی۔

ستارہ۔ ہوں! استاد رکھیں گی۔ امّی کی بڑی چلائی۔ پچھلے امتحان میں انگریزی میں پچھتر نمبر آئے۔ میں نے گھر آکر کہا تو الٹا ڈانٹنے لگیں کہ حساب میں پچھتر نمبر کیوں نہیں آئے؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ کوئی سب مضمونوں میں بھی ایک سا ہوشیار ہوا ہے؟

نعیم۔ تو آپا اتنا کمزور تو میں بھی نہیں جتنا امّی سمجھتی ہیں۔ سالانہ امتحان میں تو پاس ہو ہی جاتا ہوں۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ ہمارے سکول کے سکاؤٹ لڑکے ایک روز کے لیے باہر جا رہے تھے۔ میں نے امّی سے اجازت مانگی تو جھٹ سے ڈانٹ دیا کہ اتنا سا لڑکا ہے، ابھی سے سیر سپاٹے سوجھتے ہیں۔ اتنے سارے لڑکوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہاں کون سے ڈاکو بیٹھے تھے جو مجھے اٹھا کر لے جاتے۔ اتنا چھوٹا بھی نہیں۔ آخر چھٹی جماعت میں ہوں۔ ویسے ڈانٹنا تو امّی کی عادت ہی ہے۔

ستارہ۔ خیر! یہ تو کوئی بات بھی تھی۔ مگر میں نے جہاں امّی سے دہلیز سے باہر نکلنے کی اجازت مانگی شامت آگئی۔ روز سنتے ہیں کہ آج نمائش ہے آج عورتوں کا جلسہ ہے۔ آج فلاں سینما میں بڑا اچھا تماشا ہے۔ میری ہم جماعتیں

ہر جگہ جاتی ہیں۔ مگر کیا مجال جو امیؔ کبھی چوکھٹ سے باہر قدم نکالنے دیتی ہوں۔ آخر تنگ آکر میں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ نیر اکیا ہے تُو تو پھر بھی بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

نعیم۔ اجی جیسا جاتا ہوں بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ کبھی اجازت ملتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ شریف کو ساتھ لے جاؤ۔ نام کو شریف کہلاتا ہے مگر ہے پُورا بدمعاش۔ راستے میں کوئی نئی چیز نظر آگئی اور اس نے ٹھنک ٹھنک کر ناک میں دم کر ڈالا۔ کیا مجال جو وہاں سے ہل بھی جائے۔ اُٹھا اسے نہیں سکتا۔ پورا بورے کا بورا ہے۔ پچھلے ہفتے میں کرکٹ کا سامان لایا تھا۔ بس شریف صاحب دیکھتے ہی مچل گئے اور لگے بسورنے کہ یہ سب کچھ میرے حوالے کر دو۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ چیزیں سکول کی ہیں میری نہیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہُوا۔ آخر امیؔ نے الٹا مجھی کو دھمکایا کہ گھر میں ایسی چیزیں کیوں لاتا ہے جس سے بچے کا جی للچانے لگے۔ یہ کہہ کر سب کچھ پھینک کر بولیں کہ ڈال لے انہیں جیب میں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی — بچے کا دل للچانے لگے — ہونہہ، آیا بڑا بچہ کہیں کا؟ — یہ شریف کیا لگتا ہے ہمارا؟

ستارہ۔ بھانجا ہوگا۔ بڑی آپا کا لڑکا ہے۔

نعیم۔ کیا عمر ہوگی اس کی؟

ستارہ۔ پتا نہیں۔

نعیم۔ بھائی جان سے پوچھ لوں ؟

ستارہ۔ پوچھ لے۔

نعیم۔ بھائی جان !

سلیم۔ (ناول پڑھتے ہوئے) ہوں !

نعیم۔ یہ جو بڑی آپا کا چھوٹا سا ننھا ہے نا' یہ کتنے سال کا ہے ؟

سلیم۔ (غصّے سے) گدھے نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ یونہی اُلٹ پُلٹ باتیں کیے جائیگا۔ پہلے سوال کرنے تو سیکھ۔ بھلا چھوٹا سا ننھا کہنے کی کیا ضرورت ہے؛ لفظ ننھا خود ظاہر کر رہا ہے کہ جس چیز کا ذکر ہو رہا ہے وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ خبردار جو اب کے ڈسٹرب کیا تو ــــ

ثریّا۔ (لکھنا بند کرکے) پانچ چھ برس کا ہوگا۔ یہ کیا تم شریف کی برائیاں کر رہے ہو؟ اگر آپا نے سُن لیا تو شامت آجائے گی ــــ

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

ستارہ۔ (نعیم سے) امّی ایک دن مجھ سے بھی کہہ رہی تھیں کہ شریف کو اپنا سکول دکھالا۔ بھلا ایسے نمونے کون ساتھ لے جائے۔ جناب کا حلیہ ایسا ہوتا ہے جیسے برسوں سے کسی نے نہیں نہلایا۔ کپڑے بھی مٹی میں لتھڑے ہوئے۔ نہ تمیز ہے نہ عقل۔ اور گھروں کے بچّے بھی دیکھے ہیں مگر ایسا بدتمیز بچہ کہیں نہیں دیکھا۔ امّی کے لاڈ نے بگاڑ رکھا ہے۔ اسے تو مفت میں سر پہ چڑھا لیا ہے۔ اتنا

بڑا ہو گیا ہے پھر بھی کپڑے پھاڑ لیتا ہے۔

نعیم۔ کپڑے ہمارے بھی کون سے اچھے ہوتے ہیں؟

ستارہ میری سہیلیوں کو لو۔ سعیدہ ایسی بنی سنوری رہتی ہے کہ کیا بتاؤں عفت جہاں بھی بیٹھ جائے سب کچھ مہک اٹھتا ہے۔ عذرا ہر تیسرے روز نئی ساڑی بدل کر آتی ہے۔ یہاں ذرا کسی نئے کپڑے کی فرمائش کی اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ امی اتنی بری طرح جھاڑتی ہیں کہ بس! ابھی سے رنگین کپڑے پہن کر کہاں چلیں؟ — نئے نئے ولولے اٹھتے ہیں — ہم نے بھی دن گزارے ہیں — یہ ہے اور وہ ہے (آہستہ سے) آپا ثریا کے لیے ہر مہینے دو چار جوڑے نئے سل کر آتے ہوں گے۔

نعیم۔ اور سلیم بھائی جان کے پاس بھی بیسیوں سوٹ ہوں گے۔ طرح طرح کے تیل، قسم قسم کی کریمیں، خدا جانے کیا کیا الا بلا ان کے پاس ہے۔ جب صبح حجامت کرنے بیٹھتے ہیں تو دکان سی لگ جاتی ہے۔ اور آپا ثریا کا کمرہ تو پورا بساط خانہ ہے۔ ان کا کیا ہے وہ تو کالج بھی تانگے پر جاتی ہیں۔ بھائی جان بھی سائیکل پر چلے جاتے ہیں۔ اور آپا تمہارے لیے بھی لاری آ جاتی ہے لیکن مجھے پیدل جانا پڑتا ہے۔ اب تو خیر سردیاں ہیں، گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت سکول سے واپس آتے وقت پتا چلتا ہے۔ میرے لیے ایک سائیکل بھی نہیں جڑتی۔ کوئی پرانی سی سائیکل ہی لے دیں۔ ابا تو کہتے ہیں کہ آٹھویں جماعت میں

سائیکل لے دیں گے مگر امّی جان ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ یہ عمر پیدل چلنے پھرنے کی ہے۔ ابھی سے سائیکل پر چڑھنے لگا تو بڑھاپے میں کیا کرے گا؟ ابھی سے بڑھاپے کی فکر پڑ گئی۔ خیر مگر آپا تانگے میں جاتی ہیں یہ بھی تو آرام طلبی ہے۔ اور ویسے تانگا ہوتا بھی خالی ہے۔ آپا اکیلی جاتی ہیں ہمیں بھی ساتھ لے لیا کریں۔

سلیم (سن لیتا ہے) میاں تمہاری قسمت! میں نے تو امّی سے بہتیرا کہا کہ ثریّا کے ساتھ تم دونوں کو بھی بھیج دیا کریں۔ مگر وہ مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہیں کہ دونوں کے سکول شہر کے دوسرے سرے پر ہیں۔ اگر ساتھ بھیجا تو قباحت رہے گی۔ دراصل امّی جان کو خود بھی تو اپنی سہیلیوں کے پاس جانا ہوتا ہے۔

ثریّا۔ یہ کم بخت تانگا کیا ہوا کوئی عجوبہ ہو گیا۔ جو آتا ہے تانگا مانگ کر لے جاتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، مہینے میں بیس روز تو یہ باہر مانگا تانگا گیا ہوتا ہے۔ مجھے دوسری لڑکیوں کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ مفت کی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے اور احسان الگ سر چڑھتا ہے۔ امّی جان کی سہیلیاں تقریباً ہر گلی کوچے میں موجود ہیں۔ آج اسے تانگا چاہیئے کل اسے چاہیے (لکھنے لگتی ہے)۔

نعیم۔ (ستارہ سے) آپا! تم تو پھر بھی لاری میں جاتی ہو۔

ستارہ۔ اللہ ماری لاری ہے یا بلیک ہول۔ یوں گھٹ کر جاتے ہیں جیسے قیدی جا رہے ہوں۔ پھر لڑکیاں اس قدر ٹھنسی ہوئی ہوتی ہیں کہ جسم سُن ہو جاتا ہے۔ بازاروں میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کہیں تماشا

ہو رہا ہے تو کہیں بینڈ بج رہا ہے مگر کیا مجال جو ذرا بھی جھانک سکیں۔ ذرا گردن موڑی اور وہ عفیل خادمہ ایسے دیدے گھماتی ہے کہ جان نکل جاتی ہے۔ تُو تو پیدل جاتا ہے۔ راستے میں تماشے دیکھتا ہوگا۔

نعیم۔ یہ تماشے بھی زہر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ دو میل آنا جانا پڑتا ہے۔ کوئی جا کر تو دیکھے۔ ایسی تھکاوٹ ہو جاتی ہے کہ کیا کہوں۔ جب چھٹی ہوتی ہے تو سب لڑکے خوش ہوتے ہیں مگر مجھے یہاں تک آنا پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ (کچھ سوچ کر) ہماری سنتا ہی کون ہے۔ اصل میں ہم چھوٹے ہیں نا؟

سلیم۔ (ناول ایک طرف ہٹا کر) اور بڑے کون سے راج کر رہے ہیں ــــــ امّی جان کی حکمرانی ہم پر ویسی ہی ہے جیسی تم پر۔ کل میں نئے ریکارڈ لایا تھا۔ کیوں ثریّا؟ (ثریا سر ہلاتی ہے) شامت نے جو پکارا تو چند فلمی ریکارڈ بھی لے آیا۔ اب جو امّی ناراض ہوئی ہیں تو خدا کی پناہ۔ کہنے لگیں کہ ان ریکارڈوں کو دیا سلائی دکھا دو۔ سڑک پر پھینک آؤ۔ نگوڑے ہر ریکارڈ میں نہ جانے کیا الّم غلّم بھرا ہوا ہے۔ اگر ریکارڈ ہی لانے تھے تو نعتیہ کیوں نہ لائے؟ لو بتاؤ، بھلا میں قوالیاں لاتا یا مرثیے لاتا۔ سب دوستوں کے یہاں ریڈیو لگے ہوئے ہیں۔ میں دو سال سے زور دے رہا ہوں۔ ابّا تو ایک دفعہ مان بھی گئے تھے مگر امّی نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

ثریّا۔ ایک طرح تو اچھا ہی ہوا۔ اگر ریڈیو آ بھی جاتا تو اسے یہاں ٹکنے کون دیتا۔ امّی کی پانچ چھ درجن سہیلیوں کو خدا سلامت رکھے۔ ان کے طفیل سے

ریڈیو بیچارہ بھی ہر روز ایک نیا گھر دیکھتا۔

سلیم۔ کوئی ایک بات ہو تو کہوں بھی۔ چند روز گزرے کہ بیٹھک میں میرے کچھ دوست آگئے۔ ہم عمر لڑکے ملیں گے، آخر کو ہنسیں بولیں گے۔ اُن کے جانے کے بعد امّی نے مجھے بُلا کر پوچھا کہ کون تھے یہ لفنگے، دو گھنٹے تک دھما چوکڑی مچائے رکھی۔ اور تو بھی ان کے ساتھ مل کر ویسا ہی ہو گیا۔ نہ معلوم اس قدر پابندیاں کیوں عائد کی گئی ہیں۔ گرمیوں میں ساری دنیا کشمیر جاتی ہے۔ میرے پچاسوں ہم جماعت کشمیر گئے۔ اور اِدھر ہم ہیں کہ لو چلے، آندھی آئے، مچھر کاٹیں، رات کو حبس ہو جائے مگر ساری چھٹیاں لازماً گھر ہی کاٹی جائیں۔ کچھ دنوں کے لیے باہر چلا جاؤں تو پھر امّی جان کے طعنے ہیں۔ سیلانی ہے۔ خانہ بدوشی کو جی چاہتا ہے۔ گھر کیونکر بسائے گا۔

ثریا۔ پھر بھی آپ بڑے ہیں۔ امّی آپ کا لحاظ کرتی ہیں۔

سلیم۔ اجی ایسے لحاظ سے تو بے لحاظ ہی اچھے۔ اگر سینما جانا ہو تو سارا کنبہ ساتھ چلے۔ دوستوں کے ساتھ ذرا باہر دیر ہو جائے تو وکیلوں کی طرح جرح شروع ہو جاتی ہے۔ کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ اب تو نہ جاؤ گے؟ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اور امّی تانگے میں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ہم جماعت لڑکی مل گئی۔ اسے سلام کر دیا۔ آخر ساتھ پڑھتے ہیں۔ امّی نے گھر آکر مجھے اتنا ڈانٹا

جس کی کوئی حد نہ حساب۔ بھلا یہ کوئی ناراض ہونے کی بات تھی ؟ پھر کئی روز تک انہوں نے مجھ سے بات تک نہ کی۔ مَیں تو تنگ آ گیا ہوں اس ہر وقت کی قید سے۔ اس دفعہ بی اے کا امتحان پاس کر لوں پھر اگر گھر میں رہ جاؤں تو نام بدل دینا۔ ہوسٹل میں رہوں گا۔

ثریّا۔ میری سہیلیوں میں امّی جان کو ایک بھی پسند نہیں۔ ہر ایک میں طرح طرح کے نقص نکالتی رہتی ہیں۔ یہ چنچل ہے۔ یہ اکل کھری ہے۔ یہ چھچھوری ہے۔ یہ بدتمیز ہے۔ اس کی والدہ کے دماغ میں فتور ہے۔ بھلا دماغ تو والدہ کا خراب، لڑکی میں کیا خرابی نکل آئی ؟ ویسے بھی لڑکیوں کا پہناوا امّی کو اچھا نہیں لگتا۔ رنگ برنگے کپڑے کیوں پہنتی ہیں ؟ برقعے ایسے باریک اور شوخ کیوں ہوتے ہیں؟ کنوار پنے میں زیور کس نے بتایا ؟ خوشبو کیوں لگاتی ہیں ؟ مَیں دسویں جماعت میں پاس ہوئی تو سہیلیوں نے مبارک باد دی اور کہنے لگیں کہ پارٹی دو۔ میں نے امّی سے کہا۔ وہ رضامند تو ہو گئیں مگر اس شرط پر کہ اُسے پارٹی نہ کہا جائے بلکہ دعوت کہا جائے اور دوسرے یہ کہ مَیں کلثوم کو نہ بلاؤں۔

سلیم۔ (کلثوم کے نام سے چونک پڑتا ہے) کیا کہا کلثوم کو ــــــ کلثوم کو کیوں نہ بلایا جائے ؟

ثریّا۔ خدا جانے کیوں امّی کو بُری لگتی ہے۔ خیر، پارٹی ہوئی۔ مَیں نے چوری چھپے

کلثوم کو بُلا ہی لیا۔ بھلا اتنی لڑکیوں میں کیسے پتا چل سکتا تھا؟
سلیم۔ (مسکراتے ہوئے) خوب! گویا بُلا ہی لیا تم نے اُسے۔
ثریّا۔ وہ بات بھی آئی گئی ہوئی۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے کہ نمائش میں میں نے ایسے بُندے دیکھے کہ کیا کہوں۔ میں نے امّی سے کہا۔ وہ بولیں کہ ــــ
سلیم۔ (بات کاٹتے ہوئے) ثریّا! یہ کلثوم کلاس میں کیسی ہے؟ ہے تو شوخ کیا خاک پڑھتی ہو گی؟ مجھے تو کُند ذہن سی دکھائی دیتی ہے۔
ثریّا۔ نچلی تو بیٹھتی ہی نہیں۔ بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی ہے۔ یہ نوڑ دہ پھوڑ۔ اِسے ستا اُسے چھیڑ۔ لڑکی کیا ہے چھلاوا ہے۔ فسٹ ایئر میں پڑھتی ہے مگر اونچی جماعتوں کی لڑکیاں بھی اس سے پناہ مانگتی ہیں۔ اور یہ ہے کہ کیا مجال جو کسی کا بھی لحاظ کر جائے۔ خیر، ہمیں کیا۔ آپ بھگتیں گے اس کے گھر والے۔ ہاں تو میں نے اُن بُندوں کا ذکر امّی سے کیا۔ جڑاؤ تھے اور کام بھی اُن پر بہت اچھا اور سُبک تھا ــــ
سلیم۔ پھر شکل وصورت ہی کون سی اچھی ہے۔ چینیوں کا سا رنگ، لمبوترا چہرہ، قد بھی یونہی لمبا سا۔ دُور سے ایسی لگتی ہے جیسے چھڑی ہلتی ہوئی آ رہی ہو۔
ثریّا۔ توبہ توبہ! اتنا بھی مت گراؤ بیچاری کو۔ ہماری جماعت میں تو سب سے اچھی ہے۔ اور ویسے بھی کالج کی خوب صورت لڑکیوں میں گنی جاتی ہے۔
سلیم۔ مگر ان کی مالی حالت مجھے کچھ ایسی اچھی نہیں لگتی۔ اس کا چھوٹا بھائی

موٹر لے کر آیا کرتا ہے نا؟ کیا بے ہودہ موٹر ہے۔ بالکل بنا بنایا چھکڑا ہے کمبخت قبل از مسیح کی معلوم ہوتی ہے۔ ضرور ٹیکسلا کی کھدائی سے برآمد ہوئی ہو گی۔ پوچھنا تو سہی کبھی۔

ثریّا۔ کہہ رہی تھی کہ اب نئی موٹر لیں گے۔ گھر سے اچھے بھلے ہیں۔ جائداد بھی ہے۔ کاروبار بھی کرتے ہیں اور ملازمت بھی ہے۔ ہاں تو میں بُندوں کا ذکر کر رہی تھی ـــــــ

سلیم۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی کتنا پھُڑوس ہے۔ نویں جماعت میں پڑھتا ہے شاید۔ بالکل مریل سا ہے۔

ثریّا۔ بچّہ ہی تو ہے ابھی۔ لے دے کے دو بہن بھائی ہیں۔ ماں باپ بڑا لاڈ کرتے ہیں۔ اسی لاڈ نے تو کلثوم کو بگاڑ رکھا ہے۔

سلیم۔ مگر ثریّا! یہ تمہارے پاس اس کی اتنی چیزیں کہاں سے آ گئیں؟ ہر ہفتے کبھی رومال آ رہے ہیں کبھی کتابیں کبھی کچھ۔

ثریّا۔ آپ ہی بھیج دیتی ہے۔ میں کیا کروں۔ ایک دن کہنے لگی تمہارے بھائی انگلش میں کیسے ہیں؟

(سلیم ایک دم چونک کر ناول ایک طرف رکھ دیتا ہے)

سلیم۔ (بے صبر ہو کر) پھر تم نے کیا کہا؟

ثریّا۔ میں نے کہا اپنی کلاس میں اوّل آتے ہیں۔

سلیم۔ پھر وہ کیا بولی ؟

ثریّا۔ کہنے لگی جب سالانہ امتحان ہوگا تو میری کمپوزیشن انہیں دکھادیا کرنا۔

سلیم۔ (دل میں خوش ہوکر) اُدنہہ، مجھے بڑی فرصت ہے جو کمپوزیشن دیکھا کروں گا۔ نا بابا بخشو، مجھے اپنی پڑھائی سے کہاں چھٹکارا ملتا ہے کہ لوگوں کو پڑھاتا پھروں۔ تم نے کہہ نہیں دیا ؟

ثریّا۔ ایک روز اس کی کاپی میں آپ کی تصویر رکھی تھی۔

سلیم (اچھل کر) میری تصویر؟

ثریّا۔ ٹیم کا گروپ تھا کسی اخبار سے کاٹا ہُوا۔

سلیم۔ تم نے چھین کیوں نہ لی ؟ سبحان اللہ، اچھا لاڈ ہے۔ واہ یہ بھی خوب رہی، جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔

ثریّا۔ جب آپ بیمار تھے تو مَیں ہر روز آپ کے لیے کتابیں لایا کرتی تھی۔ معلوم ہے کہاں سے لاتی تھی ؟

سلیم۔ کہاں سے ؟

ثریّا۔ کلثوم کے ہاں سے لایا کرتی تھی۔ وہ خود ہی دیا کرتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز پوچھا کرتی تھی کہ تمہارے بھائی اب کیسے ہیں ؟ ایک دن کہنے لگی کہ میرے ڈاکٹر چچا چھٹی پر آئے ہوئے ہیں۔ کہو تو انہیں بھیج دوں۔

سلیم۔ پھر — ؟

ثریّا۔ مَیں نے انکار کر دیا۔ امّی جان کو تو اس کی پرچھائیں بھی زہر دکھائی دیتی ہے۔

سلیم۔ یہ امّی جان کی بھی خوب کہی۔ ہر بات میں ــــ

(بڑی آپا اندر داخل ہوتی ہے)

آپا۔ (ایسے جیسے سب کچھ سُن لیا ہے) کلثوم کا ذکر ہو رہا تھا۔ خوب! یہ کلثوم کیا ہوئی چھلاوا ہو گئی۔ جہاں جاؤ اسی کے تذکرے ہیں۔

سلیم۔ (خوشامد سے) نہیں تو آپا، ویسے ہی اتفاقیہ ذکر آ گیا تھا ورنہ ہمیں اس سے کیا۔

آپا۔ تمہیں اس سے کیا؟ صاحبزادے! ذرا ہوش کے ناخن لو۔ مَیں تھوڑی بہت تو تم سے بڑی ہوں۔ جب وہ کم بخت امّی کو اتنی بُری لگتی ہے تو تم دونوں بہن بھائی اس پر کیوں جان چھڑکتے ہو؟ اتنے خود سر ہو کر جاؤ گے کہاں آخر؟ اِن ثریّا بی کا تو اس سے اتنا پیار ہے، اتنی گاڑھی چھنتی ہے کہ منٹ بھر کی جدائی گوارا نہیں۔ ہر وقت اسی کی مالا جپتی ہے۔ توبہ! کلثوم بھی کوئی لڑکی ہے۔ ایسی چنچل لڑکی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ سر کا ہوش ہے نہ دوپٹے کا خیال۔ ہر وقت ترنگ میں رہتی ہے۔ اور جب وہ امّی کو ناپسند ہے تو ــــ؟

سلیم۔ (جھنجھلا کر) امّی! امّی! امّی! یہ بات بات میں امّی کیوں دخل دیتی

ہیں ؟ اگر نعیم اور ستارہ کو کہا کریں تو کوئی بات بھی ہے۔ مگر ہمیں ـــ بھلا ہم کوئی بچّے تھوڑا ہی ہیں ؟ ہنس بول نہیں سکتے۔ کہیں آجا بھی نہیں سکتے۔ کسی کا ذکر بھی نہیں کر سکتے۔ (ہونٹ بھینچ کر) ایمان سے زندگی تلخ ہو رہی ہے۔

آپا۔ امّی جان میں تو تبدیلی میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ پہلے اچھی بھلی تھیں۔ جو مرضی ہو کرو، جہاں دل چاہے جاؤ۔ مگر اب ـــ اب تو خدا جانے کیا بات ہے کہ بات بات پر چڑ جاتی ہیں۔ ابّا پھر ویسے کے ویسے ہیں۔ تم لوگوں سے کہنے کی بات تو نہیں مگر کہے دیتی ہوں۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ نجمہ یہاں آئی۔ کہنے لگی مدّت کے بعد پرانی سہیلیاں ملی ہیں۔ کسی دن پک نک ہی پر چلیں۔ میں نے امّی سے کہا۔ صاف انکار تو کیا کرتیں بس ٹال مٹول کر گئیں۔ اور ـــــــ

(ایک آہٹ)

(سیڑھیوں کے نیچے سے امّی جان کی آواز) بارہ بجنے کو آئے مگر ابھی تک بچّے جاگ رہے ہیں۔ صبح وقت پر نہیں اُٹھتے۔ ہر ایک کو کئی مرتبہ جگانا پڑتا ہے۔

(امّی جان سیڑھیاں چڑھ رہی ہیں)

امّی۔ خدا جانے اب تک کیا کر رہے ہیں یہ بچّے ؟ قصّے کہانیاں ہو رہی ہوں گی۔ ذرا دیکھوں تو سہی۔

نعیم اور ستارہ جو یہ گفتگو بڑے انہماک سے سُن رہے تھے جلدی سے رضائیوں میں دبک جاتے ہیں اور یونہی جھوٹ موٹ خرّاٹے لینے لگتے ہیں۔

ثریّا جلد جلد لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ سلیم فوراً ناول تکیے کے نیچے ٹھونس دیتا ہے اور ایک موٹی سی کتاب کھول لیتا ہے۔ آپا چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہیں۔

بیزاری

جب امتحان کے دنوں میں مجھے یک لخت تیس چالیس بیماریاں لاحق ہو گئیں۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ جگر نے ہڑتال کر دی اور سو گیا۔ کانوں میں ہوائی جہازوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹانسل چپکے چپکے بڑھنے لگے۔ اسی طرح خدا جانے کیا سے کیا ہو گیا، تو میں سیدھا سب سے قابل ڈاکٹر کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے بغور ملاحظہ فرمایا اور کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "تمہارے سب نظام اچھے بھلے ہیں۔ بس تم بیزار ہو!" میں نے بیزاری کے لیے دوا طلب کی۔ بولے "بیزاری کے لیے دوائیں بیکار ہیں۔"

اور واقعی میں بیزار تھا۔ امتحانی بیزاری میں مبتلا تھا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ خطرناک بیماریوں میں ایک بیماری بیزاری بھی ہے جس کا ذکر طب کی کتابوں میں سرے سے غائب ہے۔ امتحان میں پاس ہوتے ہی یہ بیزاری

دُور ہو گئی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں ایک مریض سے ملاقات ہوئی۔ اس اللہ کے بندے نے جو شکایتیں بتائی ہیں تو ہم کچھ دیر کے لیے چکرا گئے۔

"جگر میں گدگدی سی اٹھتی ہے۔ دل کروٹ لے کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ پھر دونوں تلملانے لگتے ہیں اور گردوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک زبردست انتشار پیدا ہوتا ہے۔ پھر جیسے بجلی کی تڑپ گردوں سے نکلتی ہے۔ ایک شاخ تو گردن تک آتی ہے اور آنکھیں مٹکنے لگتی ہیں۔ دوسری شاخ تلووں تک پہنچتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چھلانگیں مارتا پھروں۔ پھر حلق میں ایک گیند سی پھنس جاتی ہے اور کانوں میں کتنے بلّیاں شور مچاتی ہیں۔ ناک سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں اور جذبات کا طوفان لہریں لیتا ہوا خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ غالباً ایسی بیماری آج تک تو دریافت نہیں کی گئی۔ ذرا سی محنت کی تو طب میں ایک نئی بیماری کا اضافہ ہو جائے گا۔ خوشی سے میری باچھیں کھِل گئیں لیکن پھر دل میں شبہ پیدا ہوا اور خوشی کی لہر چپکے سے اتر گئی۔

میں نے پوچھا "صاحب آپ بیزار تو نہیں؟"

وہ چمک کر بولے "کیا مطلب؟"

"یعنی آپ دنیا سے بیزار تو نہیں؟" میں نے دوبارہ دریافت کیا۔

"اُفوہ! مَیں اب سمجھا۔ احقر کا تخلّص افسردہ ہے، بیزار نہیں۔ ویسے مطلب ایک ہی ہے دونوں کا۔"

"تو گویا آپ شاعر ہیں؟"

میرے دوست نے ان کا معائنہ کیا اور آخر اُن سے کہا گیا "صاحب آپ بالکل تندرست ہیں!"

بولے "یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ تو گویا ہم یہاں تفریحاً آئے ہیں"

آخر تنگ آکر انہیں بتایا کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں واقعی وہ ٹھیک ہے۔ ان کا دل گردوں کی جگہ رکھا ہے۔ گُردے تلووں میں پڑے ہیں۔ جگر دماغ تک پہنچا چاہتا ہے۔ اب علاج کا سوال تھا۔ یکایک ڈاکٹر کو کچھ سوجھ گیا۔

پوچھا "کیوں صاحب! آخری غزل آپ نے کب کہی تھی؟"

بولے "دو اڑھائی مہینے ہوئے"

پوچھا "اور بیمار کب سے ہیں؟"

بولے "بس یہی دو اڑھائی مہینے سے"

پوچھا "یہ غزل آپ نے کسی کو سنائی بھی؟"

کہنے لگے "نہیں تو"

کہا "تو آپ ہمیں سُنا دیجیے"

بولے "نہیں صاحب! یہ کیا فرماتے ہیں آپ۔ کہاں یہ ناچیز اور کہاں

اس ناچیز کا کلام۔ لیکن خیر، اگر آپ مصر ہیں تو سنیے"۔
انہوں نے آدھ گھنٹے تک اپنی غزل گا کر بلکہ رو کر (کیونکہ اس میں گانا کم اور رونا زیادہ تھا) سنائی۔ ہم نے اچھی طرح داد دی۔ جب وہ غزل سنا چکے تو ان سے کہا:

"جناب فی الحال تو آپ کے لیے علاج کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر پھر اس قسم کا کوئی دورہ اٹھے تو تشریف لے آئیے"۔
وہ ہنسی خوشی چلے گئے۔ چند مہینوں کے بعد پھر آئے۔ بُرا حال تھا۔ انتہائی بیزاری تھی۔ غزل سنائی اور مسکراتے ہوئے تشریف لے گئے۔

کوئی اوسط درجے کا گھرانا لے لیجیے۔ بچّے بیزار ہیں کہ انہیں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ امّی بیزار ہیں کہ نوکر کہنا نہیں مانتے۔ نوکر بیزار کہ میاں کے دوست بہت تنگ کرتے ہیں۔ اور میاں بیزار ہیں کہ بچّوں کے ماموں ہر تیسرے روز شکار کھیلنے آجاتے ہیں۔ ماموں بیزار ہیں کہ رائفل کا لائسنس اب تک نہیں ملا۔ چچا اگر چاہیں تو بآسانی لائسنس مل سکتا ہے۔ چچا بیزار ہیں کہ اُن کے صاحبزادے اپنی مرضی کے مطابق شادی کریں گے۔ ان کے صاحبزادے بیزار ہیں کہ جن خاتون کو وہ چاہتے ہیں وہ اب کھنچی کھنچی سی رہتی ہیں اور وہ خاتون

بیزار ہیں کہ اب ان کا ہاضمہ خراب ہوتا جا رہا ہے اور اکثر پسلی میں درد ہو جاتا ہے۔

پتا نہیں چلتا کہ یہ بیزاری شروع کہاں اور ختم کہاں ہوتی ہے۔ اور یہ سب کے سب بیزار کیوں ہیں؟ کیا بیزار رہنا ان کا شغل ہے؟

ایک مُوڈ بھی ہوتا ہے۔ یہ مُوڈ بیزاری کا چھوٹا بھائی ہے۔ (یہاں صرف بُرے موڈ کا ذکر ہو رہا ہے)۔ جب موڈ شروع ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ آدھ گھنٹے کے اندر بیزاری آیا چاہتی ہے۔

"سنائیے جناب! آپ کا کیا حال ہے؟"

"آج میرا موڈ اچھا نہیں۔"

"اوہ —!"

"کل اچھا بھلا تھا۔ آج صبح سے موڈ خراب ہو گیا۔"

"کیوں صاحب سینما چلیے گا؟"

"نہیں، معاف کیجیے۔ مَیں نے ابھی موڈ کے متعلق عرض کیا تو تھا۔"

یہ موڈ کیا ہُوا، اچھا خاصا دورہ ہو گیا کہ کیا جانے کس وقت پڑ جائے۔ اس قسم کے حضرات سے بہت ڈر لگتا ہے جنھیں موڈ کے دورے اکثر پڑتے ہوں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ یہ موڈ شروع کب ہوا تھا اور جائے گا کب؟ اور اگر چلا گیا ہے تو کب گیا ہے؟ اور پھر کس وقت آ دبوچے گا؟

اس قسم کے حضرات سے باتیں کرتے وقت دل دھڑکتا رہتا ہے۔ دعائیں

مانگتے رہتے ہیں کہ خدایا ان پر ابھی برا موڈ نہ آئے۔ اگر آئے بھی تو اس وقت جب ہم چلے جائیں۔

آپ نے مکانوں کے پھاٹک پر نام کی تختیاں دیکھی ہوں گی جن پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ 'اندر ہیں' 'باہر گئے ہیں'۔ اس کے ساتھ ہی اگر موڈ کے لیے بھی چھوٹا سا خانہ بنا دیا جائے تو ہماری مشکلیں ایک حد تک آسان ہو جائیں۔

کسی سے ملنے گئے۔ لکھا ہے کہ 'اندر ہیں'۔ آگے یہ سطر کہ 'موڈ اچھا ہے' ۔ بس ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے بے دھڑک اندر چلے گئے۔ اور اگر لکھا ہو 'اندر ہیں' اور آگے درج ہے 'موڈ اچھا نہیں' یا 'موڈ مشکوک سا ہے' (بالفاظِ دیگر بیزار ہیں) ۔ تو فوراً واپس۔

ایک مرتبہ ہمارے دوست کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم دونوں کے ذہن میں یہی بیٹھا ہوا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور خواہ محبت آگے چلے یا وہیں ختم ہو جائے اس کا اثر ساری عمر زائل نہیں ہوتا۔ چنانچہ وقت کے فرمان کے سامنے انہیں بھی سر جھکانا پڑا اور یہی سمجھ کر کہ 'یہ پہلی اور آخری محبت ہے' اپنا برا حال کر لیا۔ وہ خاتون میرے دوست سے ایک سال بڑی تھیں۔ ان کی صحت واجبی تھی۔ باتیں قنوطیوں کی سی کرتی تھیں۔ ہر وقت بیٹھی سوچتی رہتی تھیں لیکن میرے دوست کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس وقت تو علم نہ تھا لیکن اب وثوق سے کہہ سکتا

ہوں کہ وہ بیزار تھیں۔

کتنی مرتبہ میرے دوست نے کوشش کی کہ ان سے کچھ کہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تکلّف تکلّف میں نہ یہ اُن سے کچھ کہیں اور نہ وہ کچھ سمجھیں اور دونوں کا وقت مفت میں ضائع ہوتا رہے —— لیکن کچھ نہ ہُوا۔ جب بھی وہ ارادہ کرکے جاتے تو وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتیں کہ بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی اور وہ موسم وغیرہ کے متعلق گفتگو کرکے واپس آجاتے۔ ایک دن ہمیں پتا چلا کہ وہ چند دنوں کے لیے کہیں جا رہی ہیں۔ مَیں نے اپنے دوست سے کہا کہ ایسے موقعوں پر اگر چلتے چلتے اظہارِ محبت کر دیا جائے تو بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ جتنے دن وہ باہر رہیں گی انہیں تمہارا خیال رہے گا۔ اور جب وہ واپس آئیں گی تو ان کے دل میں تم ہی تم ہو گے۔ چنانچہ میرے دوست ان سے ملے ۔

بولیں " ارر —— ! ذرا پرے بیٹھو۔ یہ اتنی تیز خوشبو کیوں لگائے رکھتے ہو ہر وقت؟ مجھے تو پہلے ہی زکام ہے۔ تعجب ہے تمہیں زکام نہیں ہوتا۔"

" دیکھیے میں ذرا چند باتیں کرنا چاہتا ہوں بہت ضروری ہیں۔ آپ کہیں باہر جا رہی ہیں نا؟"

" ہاں! جا رہی ہوں۔ کوئی اعتراض ہے؟"

" لاحول ولا قوۃ —— بھلا اعتراض کیا ہوسکتا ہے؟ ویسے آپ سن لیں گی نا؟"

" سننے کو سن لوں گی، کانوں میں انگلیاں تو دینے سے رہی۔ اور یہ کیوں تم

لگاتار میری دہنی آنکھ کی طرف دیکھ رہے ہو؟ مانا کہ اوپر کی پلک ذرا سوجی ہوئی ہے — مچھر کاٹ گیا تھا۔"

"لاحول ولا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ آپ کی پلک سوجی ہوئی ہے۔ یہ تو آپ خود —!"

"تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ کیوں؟"

"نہیں لا — لاحول ولا قوۃ — بھلا میں —!"

"اور یہ کیا لاحول ولا، لاحول ولا لگا رکھی ہے۔ کوئی شیطان بیٹھا ہے یہاں؟"

میرا دوست چپ ہو گیا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ کیا تو باتیں کرنے آئے تھے اور کیا اب گم سُم بیٹھے ہو — بولو؟"

"اجی کیا خاک بولوں، جی نہیں چاہتا کچھ کہنے کو —!"

"اسی طرح بولتے ہیں بڑوں سے کہیں؟ کیا خاک کہوں — شاباش ہے! پتا بھی ہے میں تم سے ایک سال بڑی ہوں۔"

"جی ہاں! جبھی تو میں ہمیشہ آپ کا ادب کرتا ہوں، بالکل بڑوں کی طرح!"

"کیا کہا بڑوں کی طرح؟ تو تمہارے خیال میں میں پچاس ساٹھ برس کی ہوں اور تم ننھے بچے ہو — بڑوں کی طرح ادب کرتے ہو — ایک سال کا فرق بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟"

(میرا دوست پھر چپ ہو گیا)

"بولتے کیوں نہیں — چپ کیوں ہو؟ — وہ کونسی باتیں ہیں؟" وہ ڈانٹ کر بولیں۔ وہ بدستور فرش کو دیکھ رہا تھا۔

"تو گویا اب تم میرے اونچی ایڑی کے جُوتوں پر اعتراض کرو گے؟ جبھی گھنٹہ بھر سے انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہو۔ پھر کہو گے جرابیں کیوں نہیں پہنیں؟"

اتنے میں خادمہ اندر آئی۔

وہ بولیں۔ "میرا فروٹ سالٹ لاؤ۔"

پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "پیو گے فروٹ سالٹ؟"

"جی نہیں۔"

"ہاں تم کیوں پینے لگے فروٹ سالٹ؟ جیسے یہ کاٹ ہی تو کھائے گا۔ ب جا کر سب کو بتا دیا کہ میں فروٹ سالٹ پیتی ہوں۔"

"لائیے ایک گلاس پی لیتا ہوں۔"

"نہیں بھئی! مجھ پر احسان مت کرو۔ بے شک مت پیو — ہاں تو وہ نیں کیا ہیں جو تم کہنا چاہتے ہو۔ ذرا جلدی سے بتا دو۔ ابھی دس پندرہ منٹ سے میری ایک سہیلی آنے والی ہیں۔"

اس نے سوچا کہ اتنا کچھ ہُوا ہے چلو اب کہہ ہی دیں۔

پھر بڑے پُردرد لہجے میں کہنا شروع کیا "شاید یہ باتیں میں کبھی نہ کہتا، لیکن متواتر بے رُخی اور بے توجہی نے مجھے ــــ!"

"تمہارا گلا کیوں بیٹھا ہوا ہے ؛ زکام کا اثر ہے یا نزلے کا؟"

حالانکہ اس نے آواز کو پُردرد بنانے کی کوشش کی تھی۔

"گلا تو ٹھیک ہے!"

"ٹھیک کیونکر ہے ؛ میں جو کہہ رہی ہوں کہ بیٹھا ہوا ہے۔"

"جی ہاں، گلا بیٹھا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا آپ سُن لیں گی؟"

"ہاں ہاں، سُن لوں گی، سُن لوں گی، سُن لوں گی۔ کتنی مرتبہ تو کہا ہے۔ کہو تو عہد نامہ لکھ کر دستخط کر دوں ــــ"

"وہ دراصل ــــ ہاں ــــ میں ان باتوں کا جواب ابھی نہیں چاہتا۔ آپ بیشک ابھی جواب نہ دیں۔ میں ــــ"

"چچ چچ ــــ بھلا جن باتوں کا جواب تمہیں درکار نہیں اُن کے ذِکر سے فائدہ؟"

اتنے میں فروٹ سالٹ آگیا اور ساتھ ہی وہ سہیلی جس نے بالکل ان خاتون جیسا منہ بنا رکھا تھا۔

اس کے بعد میرے دوست نے کبھی کسی سے اظہارِ محبت نہیں کیا۔ چند سال کے بعد کہیں اس راز کا انکشاف ہوا کہ محبت اور بیزاری ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔

اگر بیزاری کی وجہ سوچی جائے تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ امیری کو غریبی کو لیا جائے، تو جواب صفر نکلتا ہے۔ عموماً امیر زیادہ بیزار نکلیں گے۔ غریبوں کو اوّل تو بیزار ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور جو بیزار ہوتے ہیں وہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم تو دنیا میں زبردستی بھیجے گئے ہیں۔ زندگی کا لطف تو امیر اٹھا رہے ہیں۔ اُدھر امیر ہیں کہ بہت سی دوائیں کھا رہے ہیں۔ اگر بیمار ہیں تو بھی بیزار ہیں۔ اگر بیمار نہیں تو بھی۔ اگر دبلے ہیں تو بھی بیزار ہیں اور اگر موٹے ہیں تو بھی۔ بہت سے امیر گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر رشک کھا کھا کر بیزار رہتے ہیں۔ ان سے کوئی کہے کہ بسم اللہ! جاؤ جا کر گاؤں میں رہو، منع کون کرتا ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اگر گاؤں چلے گئے تو ہفتے بھر میں بیزار ہو جائیں گے۔

کنوارے بیزار ہیں کہ شادی کر لیتے تو اچھے رہتے اور بیاہے حضرات الگ بیزار ہیں کہ کیوں کر بیٹھے؟

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بین الاقوامی بیزاری کیوں ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ یہ خواہشیں اور اُمنگیں بہانے ہیں اور ہم واقعی بیزار رہنا چاہتے ہیں۔ بیزار رہنا ہماری فطرت میں ہے اور اگر ہم بیزار نہ ہوں تو اُداس ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ادب اور خصوصاً ہماری شاعری میں حُزنیہ پہلو اس قدر نمایاں ہے

کہ اگر ہم اسے قنوطی ادب کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ویسے بھی ہماری زندگی میں رنج کو اس قدر دخل ہے کہ جس روز ہم غمگین نہ ہوں بے چین ہو جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی آکر ہمیں غمگین بنا جائے۔ جب ہم ہنستے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گناہ کر رہے ہوں اور ہمیں ہنسنے کا کوئی حق نہیں۔ خصوصاً زور زور سے ہنسنے کا۔ اس لیے مسکراہٹ کی بڑی سے بڑی لہر منٹوں میں اُتر جاتی ہے۔ ہم پھر اداس ہو جاتے ہیں اور اپنے غمگین خیالات کا سلسلہ بہ حفاظت وہیں سے شروع کر دیتے ہیں جہاں وہ قطع ہو گیا تھا۔

ایک چمکیلی صبح کو میرے ایک اور دوست نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے فوراً ہی شادی نہ کی تو نظامِ شمسی درہم برہم ہو جائے گا اور دنیا بے صبری سے ان کی شادی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ مشورہ لینے میں نے معذرت کی اور بتایا کہ ان معاملوں میں تو میں بالکل نومشق ہوں۔

کہنے لگے "نہیں مشورہ ضروری ہے اور وہ بھی تمہارا۔"

میں نے کہا "اچھا لیکن جو کچھ کرو گے اپنی ذمّہ داری پر کرو گے۔"

بولے "اس وقت میری نگاہ میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ تم سب کو دیکھ چکے ہو۔ برکت، رشیدہ، رفعت، نگہت اور صولت۔"

"دیکھا ہے!"

"تمہارے خیال میں کونسی بہتر رہے گی؟"

"سبھی اچھی ہیں۔"

"یوں نہیں، میاں زندگی بھر کا سودا ہے۔ کہیں بعد میں نہ پچھتانا پڑے۔ ذرا سوچ سمجھ کر مشورہ دینا۔"

"برکت اچھی ہے۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اوّل تو اس کا نام یونہی سا ہے۔ برکت، بھلا کیا بات ہوئی۔ کس چیز کی برکت؟ بڑا غیر شاعرانہ نام ہے۔ ویسے خاصی ہے۔ لباس پہننے کی بھی تمیز ہے۔ لیکن اِن کے ہاں ایک خاندانی مرض ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ سرگوشیوں میں بولے۔ "ان کی نانی جان کا دماغ چل گیا تھا۔"

"یعنی چل پڑا تھا اور چلتے چلتے کہیں کا کہیں چلا گیا تھا۔"

"نہیں، ان کے دماغ میں خلل آ گیا تھا۔ اور اُن کے چچا کے چچیرے بھائی بھی کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ماموں کی ممیری بہن بھی اِدھر اُدھر کی ہانکتی رہتی ہیں۔"

"اور یہ — ؟" میں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ابھی تک تو خیریت ہے لیکن ڈر ہے کیا جانے کب یہ مرض زور کر بیٹھے۔"

"اوہ — اچھا، رشیدہ سہی"

"آخر کس طرح سہی رشیدہ؟ یونہی کہہ دیا۔ دیکھتے نہیں کہ روز بروز دُبلی ہوتی جارہی ہے۔ پچھلے سال اس کا وزن خاصا تھا۔ ان سردیوں میں ساڑھے آٹھ پونڈ گھٹ گیا اور اب یہ پورے دو سٹون کم ہوگئی ہے"

"امتحان کی وجہ ہوگی"

"اجی امتحان کی وجہ نہیں۔ یوں باقاعدہ دُبلی ہوتی جارہی ہے کہ —"

"کہ تمہیں ڈر ہے کہیں دُبلی ہوتی ہوتی غائب نہ ہوجائے"

"نہیں یہ بات نہیں — لیکن پھر بھی کچھ جی نہیں چاہتا"

"تو پھر رفعت سہی"

"تم نے کبھی غور سے اس کا چہرہ دیکھا؟ ایک آنکھ چھوٹی ہے اور ایک بڑی۔ شاید دائیں آنکھ چھوٹی ہے"

"کبھی ناپ کر دیکھا؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"مذاق مت کرو۔ اور اس کے علاوہ ہر وقت گم سُم بیٹھی رہتی ہے۔ آج تک اسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ چہرہ بھی زرد ہے۔ ہاں! اور اس کے بال بھی چھوٹے ہیں۔ گرتے بھی ہیں۔ دماغی کمزوری کی وجہ سے یا نزلے کی وجہ سے"

"اور نکہت، اس کے بال کتنے لمبے ہیں اور کیسی ہنس مکھ ہے"

"لیکن اس کے موٹے ہو جانے کا بڑا ڈر ہے۔ آہستہ آہستہ سرخ ہوتی جا رہی ہے۔ دو تین سال تک خوب موٹی ہو جائے گی۔ اور وہ ہے بھی مسخری، جب دیکھو ہنستی رہتی ہے۔"

اب فقط ایک خاتون باقی رہ گئی تھیں۔ میں نے یہ سوچا شاید انہیں وہی اچھی لگتی ہوں۔

"تو پھر صولت سے کرو گے تم شادی؟"

"وہ اچھی ضرور ہے۔ اس میں خوبیاں بھی بہت سی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ باتونی ہے۔ کیا مجال جو اس کے سامنے کوئی زبان تک ہلا سکے۔ فوراً جرح شروع ہو جاتی ہے۔ بس وکیل ہے بالکل۔ اور میں ٹھہرا امن پسند شخص۔ بحث مباحثے سے بہت گھبراتا ہوں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں دیر تک سوچتا رہا۔ پھر نہایت خلوص سے بولا۔

"میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ ان حالات میں تو تم صبر ہی کر لو۔"

"صبر کر لوں؟ یعنی؟"

"کنوارے رہو۔ دنیا بہت وسیع ہے، شاید کسی روز تمہیں ---"

"پھر مذاق پر اُتر آئے۔"

"اچھا تو یوں کرو کہ قرعہ اندازی کر لو جس لڑکی کا نام آ جائے اس سے شادی

کرلو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمہارے سامنے دل کا راز کہنا تو بالکل۔"

"اچھا ایک مخلصانہ مشورہ دوں؟"

"ہاں ہاں!"

"تم چھٹی لے کر پہاڑ پر چلے جاؤ۔ وہاں عمدہ غذا کھاؤ۔ خوب ورزش کرو۔ اچھی اچھی کتابیں پڑھو۔ اور جب صحت درست ہو جائے تو واپس آ کر کسی ایک کا انتخاب کرلو۔"

"تو گویا یہ احترام ہے تمہارے دل میں میرے جذبات کا۔" وہ ناراض ہو کر بولے۔

میں نے آخر سچ سچ کہہ دیا۔ "بھائی! قصور نہ کسی لڑکی کا ہے اور نہ تیرا۔ بس تو بیزار ہے، بالکل بیزار۔ اپنی زندگی سے، اپنے آپ سے، دنیا سے، دنیا کی ہر چیز سے بیزار ہے۔"

میں اور ایک صاحب سینما دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً وہ میرے کان میں بولے۔

"سبحان اللہ کیا ناک پائی ہے۔"

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہمارے پیچھے جو صاحب بیٹھے ہیں ان کی ۔۔۔"

میں نے بڑے آرٹ سے سگرٹ سلگاتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا۔ مجھے

کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا۔

"کہاں ہے؟" مَیں نے پھر پُوچھا۔

"پھر دیکھو، بالکل ہمارے پیچھے بیٹھا ہے۔ افوہ! وہ ناک کو رگڑے ڈالتا ہے۔ اب جلدی سے دیکھ ڈالو۔"

مَیں نے پھر کروٹ سی لی اور پہلو بدل کر پیچھے جھانکا (آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ایسے موقعوں پر کتنی قباحت ہوتی ہے)۔

"نظر نہیں آیا" مَیں نے کہا۔

وہ پھر آہستہ سے بولے "مجسّم بیزاری ہے بالکل، ایمان سے دیکھنے کی چیز ہے۔ ایسی ناک کے درشن بار بار نہیں ہوتے۔ آخر تمہیں نظر کیوں نہیں آتا؟"

مَیں نے گردن مروڑ کر پھر جھانکا۔

اتنے میں میرے پیچھے بیٹھے ہوئے صاحب تقریباً رو کر بولے۔

"ادھر دیکھیے حضرت! بیزار مَیں ہوں اور میری ہی ناک وہ نادر شئے ہے جس کی تلاش میں آپ ہیں۔ للہ مجھے جلدی سے دیکھ لیجیے پھر سیدھے بیٹھ جائیے!"

اس کے بعد ان کی ناک اور ترچھی ہوتی گئی اور چہرہ بیزار ہوتا گیا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر ہم بھی بیزار ہوتے گئے۔

ایک مختصر سی بیزاری ہم موسم کے ہیر پھیر میں خواہ مخواہ مول لے لیتے ہیں۔ اور بہت سے حضرات موسم پر پیچ و تاب کھا کھا کر بیزار رہتے ہیں۔ کسی گرم دن میں لوگ گرمی کو خوب کوستے ہیں اور کسی برسات کے دن کو یاد کرتے ہیں کہ آہا ہا، کیسا ٹھنڈا اور سہانا دن تھا۔ اور برسات کے دن وہی حضرت بادلوں کو کوس رہے ہوں گے کہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ صبح سے ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ، جہاں ہاتھ لگاؤ گیلا ہی گیلا ہے۔ سورج نکلے تو کچھ فرق پڑے۔

سردیوں میں گرمیوں کا فراق ستاتا ہے۔ گرمیوں میں سردیوں کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جس روز بے کار ہوں اس روز کام یاد آتا ہے اور جب کام کر رہے ہوں تو بے کار رہنے کے لیے دل مچلتا ہے۔ کسی بات سے بھی تسلّی نہیں ہوتی۔

فرمائیں گے "وہ شام کیسی اچھی تھی۔ ہائے کتنی پیاری تھی وہ شام۔"

پوچھیے "کون سی شام اور اس میں کیا تھا؟"

جواب دیں گے "پچھلے سال جنوری کی ایک سہانی شام جب ہمیں ایک خوبصورت ترین غروبِ آفتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔" آج بھی ویسی ہی شام ہے نہایت دلفریب غروبِ آفتاب ہے۔ اِس شام ہرگز لطف نہ اٹھایا جائے گا۔ اور اگر کبھی ذکر بھی ہوا تو وہ آج سے ڈیڑھ ایک سال کے بعد ہوگا۔ چونکہ جنوری کی وہ شام گزر چکی ہے۔ اس لیے وہی اچھی تھی۔

کسی محفل میں پُر لطف باتیں ہو رہی ہیں مسکراہٹوں سے سب کے چہرے روشن ہیں شگفتگی ہے۔ یک لخت ایک دھندسی چھا جاتی ہے، جو بڑھتی جاتی

ہے۔ لوگوں پر ایک نشہ سا چڑھنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے منہ لٹکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ تنے ہوئے ہونٹ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ ماتھے پر شکنیں آجاتی ہیں۔ شگفتگی بخارات بن کر اڑ جاتی ہے۔ پہلے چند آدمی بیزار ہوتے ہیں۔ پھر دیکھا دیکھی اور بیزار ہونے لگتے ہیں اور ذرا سی دیر میں محفل کی محفل بیزار ہو جاتی ہے۔ اس سے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ بیزاری ایک قسم کی چھوت کی بیماری ہے جس کے جراثیم ہوا میں موجود ہیں۔

کوئی بڑا نفیس کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ کھلاڑی بڑی چستی سے کھیل رہے ہیں۔ لوگ بار بار تالیاں بجاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔ دفعتہً بولر ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ سلپ کے فیلڈر تو گویا زمین میں دھنس جاتے ہیں اور وقت پر کیچ نہیں کرتے۔ باؤنڈری کے فیلڈر اونگھنے لگتے ہیں۔ وکٹ کیپر کوئی عشقیہ غزل دھیمے سروں میں گانے لگتا ہے۔ بیٹسمین قسم کھا لیتے ہیں کہ نہ تو سکور کریں گے اور نہ آؤٹ ہوں گے۔ پھُس پھُس شروع ہو جاتی ہے۔ امپائر اپنی محبوبہ کے خیال میں غرق ہو جاتے ہیں اور کسی اپیل وپیل کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس وقت فضا میں ایک پوستیانہ (پوست سے نکلا ہے) اثر طاری ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والے بار بار جمائیاں لیتے ہیں اور اونگھنے لگتے ہیں۔ اس وقت یقین ہو جاتا ہے کہ بیزاری کے جراثیم ہوا میں موجود ہیں۔

بیزار بچے بھی دیکھے ہیں جو اس قدر جذباتی بن جاتے ہیں کہ اگر آپ کسی

کتے بلی کو جھڑکیں تو وہ خواہ مخواہ ٹھٹکنے لگتے ہیں۔ یا ان کا چہرہ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کوئی بت رکھا ہو۔ انہیں چھیڑو، ہنساؤ، گدگداؤ، لیکن کیا مجال جو ان پر اثر ہوتا ہو۔ بس یونہی بیٹھے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ مراقبے میں تو نہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ وہ گھر میں نہیں تھے۔ اُن کا ایک بچہ باہر آیا جس کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔ پاس آ کر چپکا کھڑا ہو گیا، نہ علیک نہ سلیک۔ پوچھا کہ "تمہارے ابا کہاں ہیں؟"

جواب ملا "باہر ہیں"

"اچھا۔ کب تک آجائیں گے؟"

بولا "پتا نہیں، شاید آنے والے ہوں۔ اور جو نہ آئیں تو رات تک نہ آئیں۔ ویسے آئیں گے ضرور، اکثر آجایا کرتے ہیں۔ آپ بیٹھیے"

میں بیٹھ گیا۔ ساتھ کے کمرے سے جھڑکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی خاتون اس بچے کو دھمکا رہی تھیں کہ "تو بالکل بدتمیز ہے" بچہ کہہ رہا تھا "میں نے کہا تو تھا کہ بیٹھ جائیے" وہ بولیں "احمق کہیں کے، ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ تشریف رکھیے"

ذرا سی دیر میں وہی بچہ منہ بنائے آیا اور کواڑ کھول کر بولا۔

"جناب تشریف رکھیے" اور واپس چلا گیا۔

ہمیں صرف عارضی طور پر کبھی کبھی بیزار ہونے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً نزلے یا زکام کے دوران میں۔ یہ بیزاری طبّی نقطہ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ امتحان کے دنوں میں بھی ہم چند گھنٹے بیزار ہو سکتے ہیں۔

یہ بیزاریاں اس لیے جائز ہیں کہ بالکل عارضی ہیں اور جلد غائب ہو جاتی ہیں۔

ہمارا سالانہ امتحان تھا۔ پرچے ختم ہو چکے تھے۔ میں انگریز ممتحن کے پاس زبانی امتحان کے لیے گیا۔ ان کے ساتھ میز پر ایک موٹا تازہ تندرست سا کتّا بیٹھا تھا۔

پوچھا "یہ کیسا کتّا ہے؟"

میں نے کہا "بہت پیارا ہے"

بولے "خوب! تو گویا تمہیں کتّے پسند ہیں"

میں نے جواب دیا "جی ہاں! میں تو کتّوں پر عاشق ہوں"

پوچھا "اچھا، تو یہ کس نسل کا ہے؟"

مجھے ان کی یہ ادا بالکل پسند نہ آئی۔ کتّوں کی نسلوں کا مجھے کچھ علم نہ تھا۔

پھر کہا "فاکس ٹیریر ہے کیا؟"

میں چپ رہا۔

بولے۔ "سپینل ہے کیا؟"

میں چپ رہا۔
کہنے لگے "کچھ تو بولو"
میں نے بیزار ہو کر کہا "صاحب! یہ بھونکنے والا کتا ہے"؟

آخر یہ بیزاری چیز کیا ہے؟ اور یہ کیوں چھا جاتی ہے؟ کوئی بیماری ہے یا قلبی کیفیت ہے؟ اس کا تعلق روح سے ہے یا جسم سے؟
یا شاید کچھ بھی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ میں نے نہایت دکھیا انسانوں کو مسرور دیکھا ہے۔ ایسے حضرات بھی دیکھے ہیں جن کی زندگی میں صبح سے شام تک ایک بھی خوشی نہیں پھر بھی وہ مسکراتے رہتے ہیں اور دوسروں کی ہمت بندھاتے ہیں۔
معلوم نہیں کہ انتہائی بیزاری میں انسان کی حالت کیا ہوتی ہے، کیونکہ زیادہ بیزار ہونے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ دل کی روشنی اور روح کی شگفتگی بیزاری کے جانی دشمن ہیں۔ خود ہی سوچیے کہ باہر باغ میں پھول کھلے ہوئے ہیں۔ پتے جھوم رہے ہیں، سبزہ لہلہا رہا ہے، کلیاں شرمائے جاتی ہیں۔ چاروں طرف چمک ہے، مسرت ہے، زندگی ہے اور ہم ایک گھٹے ہوئے کمرے میں ایک کرسی پر بیزار بیٹھے ہیں۔ اس لیے

کہ کسی نے کچھ کہہ دیا۔ کوئی بُری طرح پیش آیا۔ کہیں فون کیا اور وہاں کوئی ملا نہیں۔ یا ڈر ہے کہ کہیں کوئی بے رُخی نہ برتے۔ یا اگر کوئی وجہ نہیں تو پھر اس لیے بیزار ہیں کہ اگر بیزار نہ ہوں تو اور کریں بھی کیا۔ اور یہ بیزاری دن بھر کے پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔

عمر خیّام کی رباعیات تو آپ نے پڑھی ہوں گی۔ اگر اتفاق نہ ہوا ہو تو فرصت میں ضرور مطالعہ کیجیے۔ یہ ضروری نہیں کہ عمر خیّام کے کہنے کے مطابق ضرور سبزے پر لوٹا جائے۔ نہر کے کنارے بیٹھ کر کچھ پیا جائے اور ہر راہ چلتے سے چھیڑ خانی کی جائے۔ یہ زیادتی ہے۔ لیکن بس مسرور رہنا چاہیے اسی طرح مسرور ادب اور مسرور انسانوں کی صحبت ہماری زندگی میں نئی نئی خوشیاں لے آتی ہے۔

اس چمکیلی سنہری دنیا میں اس نیلے نیلے آسمان کے نیچے کیا کچھ نہیں؟ مسکراتے ہوئے پھول ہیں۔ ناچتی ہوئی تتلیاں ہیں۔ نسیمِ سحری کے جھونکے، برسات کی جھڑیاں، غروبِ آفتاب کا رنگین شفق — سبھی کچھ تو ہے۔

اور جب کسی ہنس مکھ اور مخلص انسان کی رفاقت میسّر ہو تو پھر بیزار ہونا گناہ ہے۔

ایک نسخہ

ہم یہ چھوٹا سا نسخہ بڑے خلوص سے بتاتے ہیں۔ یہ چند آپ بیتیوں سے اخذ شدہ ہے۔ پہلے پہل ہمارا ارادہ تھا کہ اسے سینہ بسینہ رکھا جائے۔ لیکن اب چونکہ اس کی ضرورت نہیں، اس لیے اسے شائع کرانے میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ یہ نسخہ یا عمل (جو آپ سمجھیں) تسخیرِ بزرگان کے لیے ہے۔ یعنی بزرگوں کو مسخّر کرنے کے واسطے۔

آپ شاید مسکرا دیے ہوں ۔۔۔ لیکن جن حضرات کو بزرگوں پر سحر کرنے کا اتفاق ہوا ہے انہیں ضرور علم ہو گا کہ یہ عمل کتنا مشکل ہے۔ بزرگ کسی قسم کے تعویذ، گنڈوں اور چِلّوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ نہ انہیں عجز و انکسار مسخّر کر سکتا ہے۔ ظاہری شان و شوکت اور اکڑ ان کے لیے چھچھوری چیزیں ہیں۔ شکل و صورت کی وہ ذرا پروا نہیں کرتے۔

ہمیں اس نسخے کا پتا اس وقت چلا جب ہمارے دوست ایک بزرگانہ انٹرویو میں بری طرح فیل ہوئے اور مہینوں تک انھیں اس قدر احساسِ کمتری رہا کہ ان کا سر نہ اُٹھ سکا۔

بات یوں تھی کہ ہمارے دوست کا انٹرویو تھا۔ ایک بزرگ ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ یہ اُن کی ناتجربہ کاری تھی کہ نہ تو انھوں نے ان بزرگ کے متعلق کچھ دریافت کیا اور نہ یہ پتا لگایا کہ اُنہیں اچھا کیا لگتا تھا اور بُرا کیا۔ بس وہ اپنے بناؤ سنگار میں لگے رہے۔ جب بزرگ کے سامنے پیش ہوئے تو دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور لب خشک تھے۔

باتیں شروع ہوئیں —

بزرگ بولے "آج کا دن کچھ اُداس سا ہے۔"

"جی نہیں" ہمارے دوست نے کہا "آج تو سورج خوب چمک رہا ہے۔ آپ کی کوٹھی کے چاروں طرف جو پھُول ہیں وہ خوب دمک رہے ہیں۔ ان پر تتلیاں ناچ رہی ہیں۔ اور آپ کا شوفر بھی قہقہے لگا رہا تھا۔"

"ہوں! خیر، ہوگا! — ویسے اس دفعہ سردی بہت جلد شروع ہو گئی ہے۔ ابھی نومبر کے مہینے سے یہ حال ہے۔ خدا خیر کرے۔ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ کہیں نمونیا وغیرہ شروع نہ ہو جائے۔"

"نہیں قبلہ! سردی ابھی کہاں شروع ہوئی ہے؟ کل تو میں تالاب میں

بتر رہا تھا۔ اسے ہم خُنکی ضرور کہہ سکتے ہیں، سردی نہیں۔ اصلی سردی تو کہیں جنوری میں شروع ہو گی۔"

انہوں نے چائے کی ایک چُسکی لگا کر عینک کے شیشے صاف کیے اور سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو گھُور کر دیکھا۔ ہمارے دوست نے ٹائی ٹھیک کی اور پینترا بدلا۔

"تم کچھ بے چین سے ہو رہے ہو برخوردار! کہیں تمہارے پیٹ میں درد تو نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"پیٹ میں درد! ـــ آج تک کبھی میرے پیٹ میں درد نہیں ہُوا۔"

"آج تک نہیں ہوا؟" وہ بڑے تعجب سے بولے۔ "غضب خدا کا۔"

ہمارے دوست نے اپنی پیالی میں شکر ڈالی۔

"ارے! یہ تم شکر کیوں تھوڑی ڈال رہے ہو؟ کہیں تمہیں ذیابیطس تو نہیں؟"

"ذیابیطس؟ ذیابیطس کیا ہوتا ہے قبلہ؟"

"ایک مرض ہوتا ہے!"

"اچھا تو پھر یہ ہوگا کوئی بڑھاپے کا مرض۔ بھلا اس عمر میں مجھے ذیابیطس وغیرہ کہاں ہو سکتے ہیں۔"

"تو تمہیں سچ مچ پتہ نہیں تھا کہ ذیابیطس کیا ہوتا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ!" انہوں نے پھر چائے کی چسکی لگائی اور عینک نیچی کرکے ہمارے دوست کو گھورا۔

"اور پیو — برخوردار!"

"جی نہیں! — بس!"

"شاید تمہیں ڈر ہو کہ زیادہ چائے گردوں کے لیے نقصان دہ ہو گی؟"

"جی نہیں! ویسے میں چائے تو اس قدر پیتا ہوں کہ کیا عرض کروں۔ پندرہ پندرہ پیالیاں پی جاتا ہوں۔ لیکن میرے گردے بالکل تندرست اور توانا ہیں۔"

"تو تمہارا دل ضرور دھڑکتا ہو گا؟"

"معاف کیجیے — دل تو ہر شخص کا دھڑکتا ہے!"

"نہیں یوں نہیں! — دھما دھم دھما دھم کرتا ہو گا۔ غشی کے دورے پڑتے ہوں گے۔ رات کو گھبرا جاتے ہو گے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آجاتا ہو گا۔"

"بدقسمتی سے مجھے کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"تو تمہیں آج تک کوئی مرض نہیں ہوا؟"

"جی نہیں۔"

"تو گویا تم بالکل تندرست ہو؟" وہ تقریباً چیخ کر بولے۔

"جی ہاں! اور خود ہی خیال فرمائیے بھلا میری عمر ہی کیا ہے۔"

—— یہاں انٹرویو ختم ہو گیا۔ اگلے روز پتا چلا کہ ہمارے دوست فیل ہو گئے۔

کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بے انصافی کیوں کی گئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک اور دوست ملے جن سے کسی بزرگ نے بالکل یہی سلوک کیا تھا۔ ہم نے اس معاملے پر بڑا غور کیا۔ راتیں جاگ جاگ کر گزاریں۔ صبح و شام یہی سوچتے رہے۔ آخر ہمیں پتا چل گیا۔ چنانچہ جب ہمارے تیسرے دوست کو ایک خنک سی صبح کو زکام ہو گیا اور انہیں کسی لڑکی سے اس بُری طرح محبت ہوئی کہ ان کی حالت مخدوش ہو گئی تو انہیں بھی اسی قسم کے انٹرویو سے سابقہ پڑا۔ انٹرویو کرنے والے حسبِ معمول ایک بزرگ تھے۔ ہم سب کچھ سمجھ چکے تھے چنانچہ ہم نے ان صاحب کو علیحدگی میں یہ نسخہ بتا دیا۔ انہیں ایک ایک بات یاد کرائی گئی۔ ری ہرسل کیے گئے۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو انہیں بزرگ کے سامنے بھیج دیا۔

انہوں نے ہدایات کے مطابق دو روز سے حجامت نہ کی۔ بھوک ہڑتال بھی کی۔ لباس بھی فضول سا پہن کر گئے۔ بزرگ کو دیکھ کر چہرہ اور بھی بیزار بنا لیا۔ بزرگ انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

”آج کا دن کتنا اداس ہے؟“ انہوں نے سرد آہ بھری۔

”واقعی بہت اداس ہے!“ بزرگ بولے۔

"صبح سے گرد و غبار کا خول چھایا ہوا ہے۔ آپ کی کوٹھی کے تمام پھول مرجھائے ہوئے ہیں۔ آپ کا شوفر بھی کچھ بیمار نظر آتا تھا۔"

"واقعی ؟" بزرگ نے کہا۔ ان کے لہجے میں مسرّت کی جھلک تھی۔

"جی ہاں! اور یہ موسم بھی عجیب مصیبت ہے۔ ہمیشہ وقت سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں گرمیوں سے پہلے ہی گرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اُدھر سردیوں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ اب کس قدر گرمی ہے۔ ہر وقت سَن سٹروک کا ڈر رہتا ہے۔"

"تمہیں ہوا کبھی سَن سٹروک ؟" بزرگ نے پوچھا۔

"جی ہاں! کئی مرتبہ۔ پچھلے سال تو تقریباً ہفتہ وار ہُوا کرتا تھا۔ اس سال خدا کا فضل ہے۔"

"خوب! چائے پیو گے ؟"

"نہیں قبلہ! مَیں تو چائے کے پاس بھی نہ پھٹکوں گا۔ گردوں کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ پچھلے دنوں مجھے جنب ذات الرّیہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ طبیع الموقوف اور جمیع الخسارہ بھی دیر تک رہے۔"

"اچھا تو یہ مرض تمہیں چائے پینے سے ہوئے تھے ؟"

"جی ہاں! اور مجھے ذیابیطس بھی ہونے لگا تھا۔"

"پھر ؟"

"بس بال بال بچ گیا۔ لیکن ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے"۔ بزرگ کے چہرے پر شفقت کے آثار نمودار ہو گئے۔

شربت منگوایا گیا۔ انہوں نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ان کا ہاتھ ہدایت نمبر چھ کے مطابق لرزنے لگا۔ بزرگ نے چونک کر پوچھا—

"ارے! یہ ہاتھ کانپ رہا ہے تمہارا؟"

"جی ہاں! جب میں گھبرا جاؤں تو ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں"۔

"تو تمہیں رعشہ ہے گویا؟"

"جی ہاں رعشہ الاعصابی بھی اور رعشہ الدماغی بھی"۔

"بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر"۔ انہوں نے اپنی کرسی کھینچ کر پاس کر لی۔

"شربت آپ بھی پیجیے نا قبلہ!"

"شربت سے میرے پیٹ میں بائیں طرف درد ہونے لگتا ہے اکثر"۔

"اچھا۔ صرف بائیں طرف؟ میرے تو نہ صرف بائیں طرف ہوتا ہے بلکہ دہنی طرف بھی اور کمر میں بھی—سب جگہ یک لخت شروع ہو جاتا ہے"۔

"سبحان اللہ!— تو کیا سارے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے؟"

"جی ہاں! اور جوڑوں میں بھی"۔

"کیا کہا جوڑوں میں بھی؟" بزرگ مسرت سے مغلوب ہو کر بولے۔

"جی ہاں!"

"لیکن تمہاری صحت تو ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ تمہیں اتنی بیماریاں ہو کیونکر گئیں؟"

انہوں نے ہدایت نمبر آٹھ پر عمل کرتے ہوئے کہا "دبتلہ یہ بھی کوئی بیماریاں ہیں۔ یہ تو ہر شخص کو ہوتی ہیں اور میں تو بس درشنی پہلوان ہوں"

"تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔۔۔۔ لو اور شربت پیو۔ پیٹ کے درد کا علاج کیا ہے بھلا؟"

"مجھے سب بیماریوں کے علاج زبانی یاد ہیں کبھی فرصت کے وقت عرض کروں گا"

"سچ مچ؟" وہ اپنی کرسی اور نزدیک لے آئے۔

"پرسوں یعنی پندرھویں تاریخ کو چار بجے شام سے مجھے بلڈ پریشر شروع ہو گیا ہے"

"مبارک ہو!" بزرگ چہک کر بولے "کیا ہوتا ہے یہ؟"

"جی خون کا دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے اور خون جسم کے کونے کونے میں ٹکریں مارنے لگتا ہے"

"اوہ! خون کا دباؤ۔۔۔ وہ تو میرا بھی زیادہ ہے"

"آپ کا دل دھڑکتا ہو گا۔۔۔ دھما دھم، دھڑام، دھڑام۔۔!"

"ہاں! ہاں!!"

"اور آپ رات کو گھبرا جاتے ہوں گے ۔۔۔؟"

"بالکل ۔۔۔!"

"اور آپ کے سر میں بے تحاشا درد ہوتا ہو گا؟"

"واقعی ۔۔۔!"

"بس مجھے بھی یہی ہے ۔۔۔!"

"اس کا علاج؟"

"مجھے معلوم ہے۔ کبھی پھر عرض کروں گا۔ انشاء اللہ۔"

غرض یہ کہ اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ بزرگ کی کرسی نزدیک آتی گئی۔ حتیٰ کہ دونوں کرسیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اگلے روز نتیجہ نکلا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس تھے۔ فوراً ہی وہ شادی پر اُتر آئے۔ آج کل موٹی موٹی بیماریوں کے آثار اور علاج انہیں زبانی یاد ہیں۔

ایک بات ہم بھول گئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی صاحب کو انٹرویو سے پہلے یہ پتا چل جائے کہ اس گھرانے کے خاندانی مرض کون کون سے ہیں۔ تو اُن سا خوش قسمت کوئی نہ ہو گا۔ فوراً کسی ڈاکٹر سے مل کر ان بیماریوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے لیکچر سُن لیے جائیں۔

اور ہاں حجامت اور لباس کے متعلق بھی نہیں بھولنا چاہیئے۔

قصّہ چہار درویش

راوی بیان کرتا ہے چند کلمے داستان کے۔ سنا ہے کسی ملک میں ایک تھانیدار رہتا تھا جو اپنے تھانے کا بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اس کے انصاف کا ڈنکا دُور دُور تک ایسے دائرے میں بج رہا تھا جس کا نصف قطر پچیس میل تھا۔ اس نے عدل میں نوشیرواں کو پانچ چھ مرتبہ مات کیا تھا۔ ایسا امن ملک کے کسی اور حصّے میں نہیں تھا۔ رعایا سُکھ اور چین کی بانسی بجاتی تھی۔ ہر روز چوریاں ہوتی تھیں، ڈاکے پڑتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو مذاق مذاق میں جان سے مار ڈالتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شہر میں کوئی ایسا گھر نہ تھا جس میں کم از کم دس پندرہ مرتبہ نقب نہ لگی ہو۔ مسافر کو نہ کوئی چھیڑتا تھا نہ پوچھتا تھا کہ تم کون ہو۔ بس چپکے سے اسے لُوٹ لیتے تھے۔ اگر مسافر مدافعت کرتا تو چپکے سے اسے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف بھیج دیتے۔

تھانیدار خود بڑا نیک دل، دریادل، بلکہ سمندر دل انسان تھا۔ وہ اپنی ساری تنخواہ نیک کاموں میں صرف کر دیا کرتا اور اس کا گزارہ اس رقم پر تھا جو لوگ محبت سے تحفتہً پیش کرتے۔ بعض اوقات وہ ذرا سختی سے کام لیتا اور لوگوں کو مجبور کرتا کہ وہ اسے تحفہ دیں۔ اس کا رعب اس قدر تھا کہ بزدل سے بزدل انسان اس کے سامنے کانپنے لگتا۔ اس کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ دولت، حکومت، صحت، عزت، صنعت و حرفت، جہالت اور شرارت۔ لیکن کسر تھی تو ایک بات کی۔ اس کے ہاں کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ہاں کوئی لڑکی تھی۔ نہیں! اس کے ہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اور یہی غم تھا جسے وہ گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

ایک روز آئینہ دیکھتے وقت (وہ آئینہ بہت دیکھتا تھا) اس نے نوٹ کیا کہ سر میں ایک سفید بال چمک رہا ہے۔ وہ دھک سے رہ گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ جب اگلے روز ہوش آیا تو وہ سوچنے لگا کہ ایک سفید بال اور وہ بھی سر میں، ــــ یارب العالمین میں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ ابھی میں صرف پچاس برس کا تو ہوں ہی۔ ابھی تو میں جوان ہوں ــــ بھلا اس عمر میں سفید بال! یہی عمر تو دوسری شادی کی ہے۔ واللہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اب تک کوئی لڑکا بھی نہیں ہوا جو گھر بار سنبھالے۔ اتنی بڑی جائداد کا وارث ہو اور بڑا ہو کر خاندان

کے نام کو بٹا لگائے۔

اس نے بڑی دعائیں مانگیں کہ کسی طرح یہ سفید بال سیاہ ہو جائے یا بالکل غائب ہو جائے۔ لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔ وہ بیحد غمگین ہو گیا اور ہر وقت افسردہ رہنے لگا۔ اپنی تھانیداری سے غافل ہو گیا اور سارے علاقے میں طوفان سا آگیا۔ چوری کی وارداتیں کم ہو گئیں۔ مسافر لٹنے بند ہو گئے۔ نہ لوگوں پر ظلم ہوتے نہ گھروں میں نقب لگتی۔ غرض یہ چاروں طرف خاموشی چھا گئی اور رعایا بے چین ہو گئی۔

تھانے کا سارا عملہ تھانیدار کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا اور بعض اوقات فرصت میں خون کے آنسو بہاتا۔ آخر کار تھانیدار کے مصاحبِ خاص یعنی ہیڈ کانسٹیبل سے نہ رہا گیا۔ وہ مردِ دلیر و باصفا ایک روز تخلیہ پا بولا۔ "اے میرے آقا اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں"۔ تھانیدار نے ایک آہِ سرد کھینچی جس سے چند پتھر جو وہاں رکھے تھے موم بن گئے اور بولا "کہو"۔

وہ مردِ نیک کہنے لگا "اے میرے آقا! آپ کا یہ حال دیکھ کر نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ میں تو آپ کا غلام ہوں۔ آپ جب چاہیں میری کھال کی جوتیاں کسی ماہر موچی سے بنوا کر پہن سکتے ہیں۔ یا مجھے کھولتے ہوئے تیل میں ڈلوا دیں۔ میرے خیال میں کھولتا ہوا گھی بہتر ہو گا۔ لیکن یہ ہر وقت کا غم مجھے کھائے جاتا ہے۔ آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کی رعایا کا کیا حال ہے۔ اغیار ہم پر ہنستے ہیں۔ مہینے گزر گئے ہیں نہ کوئی چوری ہوئی ہے نہ کوئی ڈاکہ پڑا ہے۔ مسافر ہیں کہ

مزے سے سفر کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں لوٹ رہا۔ اندھیر ہے اندھیر!
میرے آقا یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ آپ وجہ بھی تو مفصّل طور پر بیان کیجیے۔ شاید
یہ ہیچمدان اور ناچیز کچھ کر سکے۔"

تھانیدار نے تالی بجائی۔ دو سپاہی آگئے۔ تھانیدار بولا "ہمارا گاؤ حقّہ اور
فرشی تکیہ لے آؤ۔"

اب تو ہیڈ کانسٹیبل آنسو ضبط نہ کر سکا اور گویا ہوا۔ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! اس
سے پہلے تو سرکار کبھی نہ بہکتے تھے۔ یہ آج کیا ہو گیا؟ میرے منہ میں خاک، حضور!
آپ نے غلط حکم دیا ہے۔ آپ ان سے فرمائیے کہ یہ فرشی حقّہ اور گاؤ تکیہ
لے آئیں۔"

دونوں چیزیں آگئیں۔ تھانیدار نے حقّہ پینا شروع کیا اور اپنی رام کہانی سنائی۔
اس پر ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ "حضور! خدا سے نااُمیّد ہونا کفر ہے۔ جب تک
سانس ہے تب تک آس ہے۔ جہاں خدا تعالیٰ نے غم دیا ہے وہاں اس کا
توڑ بھی اتارا ہے۔ بس آج سے آپ خواہ مخواہ خوش رہا کیجیے۔ اس سے آپ
کی صحت پر خواہ مخواہ اچھا اثر پڑے گا۔ آپ ہر رات کو دو ہزار نفل پڑھا کیجیے۔
اس سے ثواب بھی ہو گا اور ورزش بھی ہو جائے گی۔ اور آپ علی الصبح
قبرستان میں جا کر دعا مانگیے، اس سے آپ کا جی بہلے گا۔"

تھانیدار یک لخت مسرور ہو گیا۔ اسے جیسے نئی زندگی مل گئی۔ وہ خوب زور و شور

سے کام کرنے لگا۔ چوریاں، ڈاکے، لوٹ مار، قتل و غارت، سب پھر شروع ہو گئے اور رعایا مطمئن ہو گئی۔

وہ ہر روز قبرستان میں جا کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات وہیں سو بھی جاتا۔ نوکر اس کا کھانا وہیں لے آتا۔ ایک روز اسے وہاں ایک سفید ریش بزرگ ملے جن کی ڈاڑھی بالکل سفید تھی۔ انہوں نے اسے بہت ڈانٹا اور چمک کر بولے "آخر یہاں رکھا کیا ہے جو تو روز ہمیں دق کرنے آجاتا ہے؟ آخر تو کیوں ہمیں بلاوجہ ڈسٹرب کیا کرتا ہے؟"

تھانیدار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور بولا "مجھ پر زمین تنگ ہے اور آسمان کشادہ ہے۔ یہ فقیر خودکشی پر آمادہ ہے۔ صرف ایک اللہ کا سہارا ہے۔ اب جگ میں کون ہمارا ہے۔"

بزرگ سے اس کی آہ وزاری دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے کہا "اللہ رحم کرے گا۔ اچھا تو آج رات اڈہ اعجاز خاں کے پڑوس والے کالج کے ہوسٹل میں جائیو۔ وہاں تجھے چار درویش ملیں گے جو رات کو آپ بیتیاں سنا کر دل کی بھڑاس نکالیں گے۔ وہاں تجھے گوہرِ مقصود ہاتھ آئے گا۔ کامیابی تیرے قدم چومے گی اور تو شاداں و کامراں واپس آئے گا۔ کہیں ان کے سامنے مت چلا جائیو۔ چھپ کر ان کی باتیں سنتا رہیو۔ کہیں وہ تیری شکل دیکھ پائیں اور ڈر کے مارے بھاگ جائیں۔" تھانیدار نے مؤدبانہ سلام کیا اور رات گئے ہوسٹل پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ بڑی

دیوار کے باہر درختوں میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر دیا جل رہا ہے اور چار پُراسرار شبیہیں بیٹھی ہیں۔ پہلے تو وہ اتنا ڈرا کہ گھگی بندھ گئی۔ لیکن آخر تھا نیدار تھا، چپکے سے نزدیک گیا۔ دیکھا کہ چار درویش بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے مٹی کے آبخورے میں بکری کا دودھ اور خشک چھوہارے رکھے ہیں۔ درمیان میں حقّہ رکھا ہے۔ ایک درویش بھنگ گھوٹ رہا ہے اور باقی انتظار کر رہے ہیں۔ بھنگ کو دیکھ کر تھانیدار کا برا حال ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً درویشوں میں شامل ہو جائے لیکن پھر بزرگ کی نصیحت یاد آ گئی اور وہ ضبط کر گیا۔

چاروں درویشوں نے بھنگ کا ایک ایک پیالہ چڑھایا اور حقّہ پینے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بولا "بھائیو! یہ پہاڑ سی رات کیونکر کٹے گی۔ کچھ کہو کچھ سنو۔ انسان انسان کا تریاق ہے اور جی بہلاوے کے بغیر زندگی عذاب ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم میں سے ہر ایک باری باری آپ بیتی سنائے تاکہ ہم سب محظوظ بھی ہوں، عبرت بھی حاصل کریں اور رات بھی مفت میں کٹ جائے۔ سب نے سر ہلایا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ پہلے میں آپ بیتی سناؤں۔ بڑا جھگڑا ہوا۔ آخر طے ہوا کہ جو درویش بائیں طرف بیٹھا ہے وہ آپ بیتی شروع کر دے۔

داستان پہلے درویش کی

پہلے درویش نے آہ سرد کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر بڑی دردناک آواز

میں بولا ـــــ

قصہ مرا سنو، مرا قصہ ذرا سنو   یا اک دفعہ یا دو دفعہ یا بار ہا سنو
سننے ہو تو سنو نہیں سنتے تو نا سنو   لیکن مرے خیال میں قصہ مرا سنو

مجھ غم کے مارے کی داستانِ غم بڑی غمگین اور غمناک ہے۔ ناچیز کا وطن جنوب میں ہے اس لیے رنگ ذرا سیاہ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا والدین کو مہربان پایا۔ مال و دولت کی حد تھی نہ حساب۔ روپے پیسے میں کھیلا۔ جاں نثار دوست جو میرے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کو تیار تھے' ہر وقت ساتھ رہتے۔ ایسے موافق حالات میں میری تربیت ہوئی کہ میں بہت جلد بڑا ہو گیا۔ ساتھ ساتھ فنِ سپہ گری، فنِ معماری، فنِ خطاطی اور فنِ ماہی گیری میں بھی میں طاق ہو گیا۔ جب میں نے پچیس سال کی عمر میں دسویں جماعت پاس کی تو اس حیرت انگیز کامیابی اور قابلیت کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ لیکن فلکِ کج رفتار و ناہنجار و نا معقول کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے کالے کوسوں دور ایک کالج میں بھیج دیا گیا جہاں نہ کوئی رفیق تھا نہ کوئی غمگسار۔ نہ چارہ ساز تھا اور نہ چارہ۔ چند روز تو پریشان رہا لیکن روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ طبیعت میں روانی تھی۔ دل میں جولانی تھی۔ ہم نے کچھ ٹھانی تھی۔ چند ہی ہفتوں میں بے شمار دوست بن گئے۔ ان سے مل کر طبیعت تو بہت خوش ہوئی لیکن ایک بات کا غم لگ گیا۔ وہ یہ کہ سب کے سب کسی نہ کسی سے محبت کرتے تھے اور میں ابھی تک اس نعمتِ غیر مترقبہ

سے محروم تھا۔ پہلے تو فقیروں اور درویشوں کی طرف رجوع کیا۔ پھر خود دعا مانگی کہ محبت ہو جائے لیکن کچھ نہ ہُوا۔ اتفاق سے ایک مصوّر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں ایک تصویر دیکھی۔ بس آدھا سانس اوپر اور آدھا نیچے رہ گیا۔ کیا بیان کروں کہ وہ تصویر کیسی تھی اور اس میں میں نے کیا دیکھا۔ یا یوں کہیے کہ اس میں میں نے کیا نہیں دیکھا۔

قصّہ مختصر، دل و جان سے اس تصویر پر عاشق ہو گیا۔ آنکھوں میں بیقراری، لبوں پر آہ و زاری اور دل میں بیماری رہنے لگی۔ ایک ماہ کے اندر اندر ہی میرا حال زبوں ہو گیا۔ بالکل پہچانا نہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اپنے آپ کو پہچان نہ سکتا، یہی سمجھتا کہ کوئی اور ہُوں۔ یار دوست کترانے لگے۔ وہی دوست جو دانت کاٹے پراٹھے اور دانت کاٹے شامی کباب کھاتے تھے۔ اب موقع دیکھ کر کنّی کاٹ جاتے۔ ہر روز طرح طرح کے بہانوں سے اس مصوّر کے ہاں جاتا۔ ہر ہفتے اپنی تصویر اتروانا اور اس حسینۂ پُرتمکین ماہ جبین و نازنین کی تصویر دیکھ کر آتشِ شوق بجھاتا۔ ذرا تصویر آنکھوں سے اوجھل ہوتی تو آتشِ شوق دوبارہ بھڑک اٹھتی۔ مصوّر نے مجھ سے بے رخی ظاہر کی۔ پہلے تو میں نے یہ شعر پڑھا۔

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

لیکن وہ باز نہ آیا۔ چار و ناچار مجبور ہو کر میں پوچھ ہی بیٹھا کہ یہ تصویر کس کی ہے۔ اس نے کہا۔" اے نوجوان! کیا تُو نے باؤلے کُتّے کو کاٹا ہے، یا تجھے قضا نے پکارا ہے، یا تیرے دن سیدھے آئے ہیں جو ایسا سوال کرتا ہے؟ خبردار! جو آئندہ اس تصویر کے متعلق کچھ پوچھا۔" لیکن عشق کے مارے ہوئے کس کی پرواہ کرتے ہیں؟ تصویر نے میرا پیچھا چھوڑا۔ اُدھر میں نے مصوّر کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہیں بیٹھا رہتا، حتیٰ کہ وہ دکان بند کرتا اور گھر کا قصد کرتا۔ میں اس کا تعاقب کرتا اور ساتھ ساتھ اس کے گھر چلا جاتا۔ علی الصبح جب وہ واپس آنے لگتا تو میں بھی ساتھ آتا۔ اسی طرح مدّتیں گزر گئیں۔ آخر اس موم کا دل پتھر ہوا اور اسے مجھ پر ترس آ گیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولا۔" قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اگر جان بوجھ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتا ہے تو بسم اللہ، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ سمجھ لے کہ یہ حسینۂ نازنین شمال کے شہنشاہ یعنی حضورِ خوابیدہ تخت کی بیٹی ہے اور تجھ سے ہزاروں جوان اس کی جوتی کی نوک پر سے قربان ہیں۔ یہ کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔"

یہ سنتے ہی میں اس کے قدموں پر گر گیا اور بولا "اے بزرگِ مشفق میری مدد فرمائیے۔" اور دن رات ان کی خدمت کرنے لگا۔ دن گزرتے گئے اور میرا عشق دن چوگنی اور رات دوگنی ترقی کرتا گیا۔ کیونکہ رات کو یہ فقیر سو جایا کرتا۔ آخر ایک روز اس نے مہربان ہو کر کہا۔" ہمیں شروع سے تیرا خیال رہا ہے۔

عرصہ ہوا کہ ہم نے تیری ایک رِی ٹچ کی ہوئی تصویر اس شہزادی کے پاس بھیج دی ہے اور ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ تجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ اب تو سیدھا کشمیر کا رخ کر۔ وہاں سے سیدھا شمال کی طرف چلا جائیو۔ جب شمال تک پہنچ جائے تو پھر شمال کی طرف چل دیجو۔ وہاں تیری مراد بر آئے گی لیکن ہمیں نہ بھولنا۔ جو شخص تجھے ملے اس سے ہمارا ذکر ضرور کیجو کہ اسے اچھی اور سستی تصویر اتروانی ہو تو سیدھا ہماری دکان کا رخ کرے۔"

اب بڑا جو دیکھتا ہوں تو ایک دمڑی بھی نہ تھی جس کی ٹھریاں، جن کا ذکر اصلی قصہ چہار درویش میں ہے، کھا کر اوپر سے پانی پی لیتا۔ یار دوست پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ دشمن بھی ناراض تھے۔ سوچا کہ چلو بہن کے پاس چلیں لیکن اس بیچاری سے تو عرصے سے خط و کتابت بند تھی۔ جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو بہن کے ہاں جانا پڑا۔ وہ ماں جائی مجھے اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بلائیں لیں، مسند پر بٹھایا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا۔

"بھیا! تیرا کیا حال ہوا؟" میں اصلی بات تو بتا نہ سکا۔ بولا "مجھے کئی ہفتوں سے بخار آ رہا ہے۔" وہ فوراً ایک سنہری کشتی میں دودھ کا پیالہ اور کونین کی دو گولیاں قرینے سے سجا کر لے آئی اور بولی "انہیں نوش کر۔" حق تو یہ ہے کہ بہن نے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ دن میں چار چار گھنٹے کے بعد دودھ کا ایک پیالہ اور کونین کی دو گولیاں خود بخود مِل جاتی تھیں۔ آخر ایک روز

وہ کہنے لگی "بھیا! تیری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ تُو کشمیر چلا جا" اور میرا رُواں رُواں خوشی سے ناچنے لگا۔ مَیں نے حامی بھر لی۔ وہ بولی "سوداگروں کا ایک قافلہ کشمیر جا رہا ہے۔ تُو اپنا سامان اُن کے سپرد کر کے رسید لے لے اور مزے سے ٹہلتا ٹہلتا کشمیر پہنچ جا۔" مَیں نے سامان سوداگر کے حوالے کر دیا اور بہن سے رخصت چاہی۔ اس نے تالی بجائی۔ ایک حبشی قلماقنی سیکنڈ ہینڈ سنہری پوشاک اور دو کشتیاں نئے پیسوں سے بھر کر لے آئی۔ مَیں نے بڑی حجت کے بعد یہ سب کچھ لے لیا۔ چلتے وقت بہن نے بلائیں لیں، امام ضامن باندھا اور بولی۔ "جس طرح منہ دکھا رہے ہو اسی طرح کسی دن پیٹھ بھی دکھا دینا۔" مَیں چل پڑا۔ راستے میں مصیبتیں آئیں۔ آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی جگہ مار پٹائی بھی ہوئی۔ لیکن شوقِ دیدار روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دن میں ایسی جگہ پہنچا جہاں نہ چرند تھے نہ پرند۔ یہاں تک کہ درند بھی غائب تھے۔ جہاں تک نظر جاتی گھاس ہی گھاس دکھائی دیتی تھی۔ بڑا ضبط کیا لیکن بھوک سے مجبور ہو کر گھاس کھانی شروع کر دی۔ پہلے پہل تو بدمزہ لگی لیکن پھر عادت ہو گئی۔ شام تک مَیں گھاس چرتا اور رات کو سو جاتا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھ میں تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔ مَیں کچھ کچھ گھوڑا بنتا جا رہا تھا۔ میری آواز میں ہنہناہٹ آ رہی تھی۔ مَیں بے حد چُست ہو گیا تھا۔ بھاگتا خوب تھا۔ اور ایک دفعہ تو مَیں نے ہوا میں دولتّی بھی مار دی۔ بہت گھبرایا اور عبادت کرنے لگا۔ بڑی دعاؤں کے بعد مَیں گھوڑے سے آدمی بنا۔ خیر، تو ایک روز مَیں

منزلِ مقصود پر جا ہی پہنچا۔ ایک جگہ یہ بورڈ آویزاں تھا ــــ

'مقصودِ منزل'

رات خاصی گزر چکی تھی۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ اس لیے فصیل کے باہر قیام کیا۔ بستر بچھا کر سونے ہی لگا تھا کہ یکایک ایک آواز آئی جس نے مجھے چونکا دیا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ نزدیک جا کر جو دیکھتا ہوں تو ایک زخمی کتّا پڑا کراہ رہا ہے۔ مجھے ترس آ گیا اور اسے اٹھا لایا۔ دوسرے روز صبح کو شہر کے دروازے کھلے اور میَں اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے میَں نے کتّے کو ایک قابل ڈاگ سپیشلسٹ کے حوالے کیا اور خود ایک سرائے میں جا ٹھہرا۔ کئی روز کے علاج اور تیمارداری کے بعد کتّا تندرست ہوا۔ اس نے غسلِ صحت کیا اور میری جان میں جان آئی۔ میَں اسے ساتھ لے کر گلیوں میں پھرا کرتا۔ ایک بزرگ نے مجھے ٹوک دیا۔ بولے "اے نوجوان کچھ جانتا بھی ہے کہ بغیر پٹّے کے کتّا ساتھ لیے پھر رہا ہے؟ میونسپلٹی والوں نے دیکھ لیا تو تیرا زن بچّہ کولھو میں پلوا دیا جائے گا۔"

میَں نے کہا ــــ "قبلہ میرے پاس زن بچّہ ہے ہی نہیں، میں تو خدا کے فضل سے کنوارا ہوں۔"

بزرگ بولے ــــ "اگر زن بچّہ نہیں تو فکر کرنا بے سُود ہے۔ پھر بھی احتیاط لازم ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلنے لگے۔ میَں نے روک لیا اور مؤدبانہ عرض کیا۔

"کیا آپ میرے ساتھ قہوہ پئیں گے؟" انہوں نے دعوت منظور فرمائی اور کافی ہاؤس میں بتایا کہ یہ کتا شہزادی مہ جبیں کا ہے۔

میں نے بے چین ہو کر پوچھا "یہاں سے شمال کی طرف بھی کوئی شہزادی رہتی ہے؟" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے پھر پوچھا — "تو پھر آس پاس ہی کوئی شہزادی رہتی ہو؟" وہ جھنجھلا اٹھے — "تم نوجوانوں کو گفتگو کا کوئی اور موضوع ہی نہیں ملتا۔ بھلا تم پالیٹکس کے متعلق کیوں نہیں باتیں کرتے؟ کہہ تو دیا ایک دفعہ کہ اس ملک میں ایک شہزادی ہے اور وہ ہے ماہ جبیں۔ یہاں تو کئی کئی سو میل تک کوئی شہزادی نہیں پائی جاتی۔" اور میرا شبہہ یقین میں تبدیل ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی کافر محبوبہ ہے جس نے میرے دل کا خون کیا ہے اور مجھے مجنون کیا ہے۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ اگلے روز میں کتا لے کر محل پہنچا۔ وہاں دربان کے ہاتھ وزٹنگ کارڈ بھجوایا۔ ایک حبشی غلام ننگی تلوار تھامے آیا اور ایک سرنگ کے رستے مجھے اندر لے گیا۔ وہاں ڈرائنگ روم میں مجھے ایک قیمتی مسند پر بٹھا دیا گیا جس میں بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک کنیز طرح دار آئی اور بولی "آپ جنوب سے تو نہیں آ رہے ہیں؟"

میں نے کہا — "ہاں" — تھوڑی دیر کے بعد ایک خواجہ سرا آیا اور بولا۔ "شہزادی صاحبہ دریافت فرما رہی ہیں کہ کیا آپ وہی جنوب کے شہزادے

تو نہیں جنہیں مصوّر عمرِ عیّار نے بھیجا ہے ؟" میں نے سر ہلا کر کہہ دیا۔ "ہاں میں وہی ہوں۔"

اس کے بعد فوراً محفلِ رقص و سرود گرم ہو گئی اور ایک پُر تکلّف دعوت شروع ہوئی۔ ایک ہفتے تک یہ دعوت رہی لیکن وہ بُتِ طنّاز نہ آئی۔ بڑے بڑے مہمانوں سے میں نے اندر جانا چاہا مگر چند جن اور دیو جو پہرہ دے رہے تھے انھوں نے مجھے واپس کر دیا۔ آخر میں نے ایک معمّر خاتون سے پوچھا۔ "شہزادی مہ جبیں کیوں نہیں آتیں ؟" وہ بولیں — "تم ہرگز ہمارے کاموں میں دخل مت دو جس طرح ہو اسی طرح چپ چاپ زندگی کے دن پورے کر دو۔"

میں نے یہی سوال ایک خاتون سے کیا۔ وہ بولیں۔ "خبردار جو یہ بات پھر منہ سے نکالی۔ اپنے منہ کو سی لو۔ سوئی تاگا میں ابھی بھجوائے دیتی ہوں۔"

کئی کنیزوں سے یہی سوال کیا۔ سب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور بولیں۔ "چپ"۔ ایک نے کہا۔ "ہشت۔"

تنگ آ کر میں نے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ "میں شہزادی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جواب آیا۔ "کیوں ملنا چاہتے ہیں ؟"

میں نے کہلوایا۔ "شربتِ دیدار پینا چاہتا ہوں۔"

جواب آیا۔ "شربتِ کیوڑا پی لو۔"

میں نے کہلوایا۔ "عاشقِ ناشاد سے یہ بے رُخی اچھی نہیں۔"

جواب ـــ" چہ خوب، گویا آپ بھی میرے عاشق ہیں۔ آپ ہیں کس کھیت کی گاجر؟ آپ نے پہلے ہی مجھے بدنام کر دیا ہے۔ میری امّی آپ سے بے حد خفا ہیں"

میں نے ایک شعر لکھ کر بھیجا ـــ

سچ ہے میں نے ہی تو بدنام کیا ہے تجھ کو
مجھ سے پہلے تری شہرت کبھی ایسی تو نہ تھی

اس کا جواب آیا کہ "اوّل تو یہ شعر چرایا ہُوا ہے۔ دوسرے ترقی پسندانہ نہیں"

آخر میں نے تنگ آکر کہلوایا کہ میں واپس جا رہا ہوں۔

جواب آیا: "جائیے مت! میں تو مذاق کر رہی تھی" غرض یہ کہ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ آتشِ عشق نے پھونک ڈالا۔ آتشِ الفت نے بھسم کر ڈالا۔ شوقِ دیدار نے تڑپا ڈالا۔

خدا کا کرنا کیا ہُوا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا بھاگا بھاگا آیا اور بولا "چلیے حضور! ایک تماشا دکھاؤں" میں فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے حرم سرا میں لے گیا۔ وہاں جو نظارہ دیکھا تو بس آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میرے سامنے آسمان سے ایک کھٹولا اُترا جس میں سے ایک مکروہ صورت اور بد سیرت جن نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ خواجہ سرا بولا۔

"حضور! آپ چُپ کیوں کھڑے ہیں؟ یہ جن شہزادی کو اغوا کرنے آیا ہے"

مَیں نے فوراً اسے للکارا اور مقابلے کی دعوت دی۔ جن فوراً انسانی روپ میں آ گیا
اور کہنے لگا۔

"کیوں تیری قضا نے تجھے پکارا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو انٹلکچوئل ہے اور
خودکشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر تُو واقعی لڑنا چاہتا ہے تو یہ جگہ لڑنے کے لیے ہرگز
موافق نہیں۔ نہ یہ وقت لڑنے کا ہے اور نہ مَیں لڑائی کے مُوڈ میں ہوں۔ بہتر
ہوگا کہ ہم کل یونیورسٹی گراؤنڈ میں لڑیں اور سارا شہر تماشا دیکھے۔"

چنانچہ اسی طرح ہُوا۔ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ اگلے روز ہمارا مقابلہ
ہوا۔ ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے ہم دونوں آمنے سامنے ہوئے۔ سب
سے پہلے مَیں نے اسے دھمکایا۔ اس نے بھی جواب میں دھمکایا۔ مَیں نے اس
کا منہ چڑایا۔ اس نے بھی یہی کیا۔ دفعتہً مَیں نے پھُرتی سے آگے بڑھ کر ایک
چپت رسید کیا جس کا جواب گھونسے سے ملا۔ مجھے طیش آ گیا اور مَیں نے اسے
زور سے ایک طرف دھکیل دیا۔ اسے بھی غصّہ آ گیا اور بڑے زور سے لڑائی شروع
ہو گئی ـــــ دیکھنے والے دم بخود رہ گئے۔

لیکن اس طرح کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دفعتاً حاکمِ وقت نے، جو ریفری کے
فرائض بھی انجام دے رہا تھا، سیٹی بجا کر فاؤل دیا اور ہمیں حکم دیا کہ اب اصلی
لڑائی شروع کر دیں۔ چنانچہ ہم دونوں نے زرہ بکتر پہنے اور فولاد میں غرق
ہو کر ایک دوسرے کا بیڑہ غرق کرنے کو آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ

زرہ بکتر کچھ ایسے تھے کہ انہوں نے ہمیں بالکل چھپا لیا۔ کسی چیز کا بھی پتہ نہ چلتا تھا۔
میں نے گرزلے کر دھما دھم اس کے زرہ بکتر کو کوٹنا شروع کر دیا اور اس نے میرے زرہ بکتر کو دیر
تک یونہی ہوتا رہا۔ اس کا زرہ بکتر WAR کوالٹی فولاد کا بنا ہوا تھا چنانچہ مڑنا شروع ہو گیا۔ ذرا سی
دیر میں میرے سامنے ایک مڑا تڑا زرہ بکتر پڑا تھا جس کے اندر غالباً میرا حریف تھا۔ ایک غلغلۂ
تحسین و آفرین بلند ہوا۔ میرے آٹو گراف لیے گئے اور اگلے روز اخباروں میں میری
تصویریں نکلیں۔ شہزادی سب کچھ سُن چکی تھی۔ جب میں محل میں پہنچا تو
وہ دوڑی دوڑی آئی — اور ہم نے پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ خدایا!
اس وقت زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا تو بہتر تھا۔ میں نے
دیکھا کہ شہزادی مہ جبیں وہ شہزادی نہیں تھی جس پر میں عاشق تھا۔ یا یوں کہ
وہ تصویر نہیں تھی جس پر میں عاشق ہُوا تھا۔ ادھر شہزادی نے ایک خادمہ
کے ہاتھ تصویر منگوائی۔ اسے میری شکل سے ملایا۔ تصویر اس قدر ری ٹچ ہو چکی تھی
کہ میں وہ شہزادہ نہ نکلا جس پر شہزادی عاشق تھی۔ ہم دونوں غلط ہستیوں سے
محبت کرتے رہے تھے۔ شہزادی اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکی اور بیہوش
ہو گئی۔ میں مال روڈ پر کسی مستند کیمسٹ کی دوکان سے لخلخلے کی تلاش میں نکلا
تو ایک بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو دیکھتا ہوں
کہ نہ محل ہے نہ شہزادی بلکہ ایک لق و دق جنگل ہے۔ غالباً چھانگے مانگے
کا جنگل۔ اور میرے سامنے مٹی کے آبخورے میں بکری کا دودھ اور پانچ

چھوہارے رکھے ہیں۔ میں انہیں کھا کر جلدی سے راستے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے ایک سبز پوش بزرگ ملے جنہوں نے بالکل سبز رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ تُو فلاں شہر کے فلاں کالج میں چلا جا۔ وہاں ہوسٹل میں تجھے تین درویش ملیں گے جو تیری طرح ناشاد و نامراد ہوں گے۔"

"معاف کیجیے" ایک درویش بولا۔ "وہ بزرگ آپ کو گوجرانوالہ کے آس پاس تو نہیں ملے تھے کیا؟"

"جی ہاں، بالکل وہیں!! — کیوں؟"

"مجھے بھی وہ وہیں ملے تھے، خیر! میں اپنا قصّہ بعد میں سناؤں گا۔"

"بس بھائیو! میں شکستہ دل ہو کر یہاں چلا آیا اور تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ کہنے کو تو زندہ ہوں لیکن مُردوں سے بدتر۔ بس زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔"

قصّہ دوسرے درویش کا

دوسرے درویش نے بھنگ کا ایک اور گھونٹ بھرا اور بولا —

پہلے اُس نے مُس کہا پھر تَق کہا پھر بِل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیے

— اس ناچیز کا وطن مشرق میں ہے اس لیے چاول اور مچھلی کا خاص شوق ہے۔ میں نہایت نحیف و نزار، بدقسمت، بدنصیب اور بدمذاق ہوں۔ شاید

ہی کوئی ایسی آفت ہو جو مجھ پر نازل نہ ہو چکی ہو۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ قدرت جب کبھی کوئی نئی مصیبت ایجاد کرتی ہے تو میری رائے ضرور لیتی ہے۔

میں پیدا ہُوا تو والدین کئی سال پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ جس دن میں اس دنیا میں آیا سنتے ہیں اس روز ہمارے شہر میں دن بھر زلزلے آتے رہے۔ ہزاروں مکان گر گئے۔ کئی وبائیں پھیلیں۔ اور آگ بھی لگ گئی۔ جس روز مجھے مدرسے میں داخل کرایا گیا اسی روز ہیڈ ماسٹر صاحب کو باؤلے کتّے نے کاٹ لیا۔ اسی رات سکول میں چوری ہو گئی اور کوئی تمام میزیں، ڈیسک اور کُرسیاں چرا کر لے گیا۔ جہاں کہیں میں جاتا وہیں بدقسمتی میرے ساتھ رہتی۔ جہاں سے گزرتا لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ سب مجھے گھُور گھُور کر دیکھتے۔ بوڑھے آدمی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے کہ یہ لڑکا کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔ اور جب میں گھر پہنچتا تو جتنے پرندے منڈیر پر بیٹھے ہوتے فوراً پٹ پٹ زمین پر گرتے، اور سب کا دم نکل جاتا۔

اُدھر دن بڑی سرعت سے گزرتے جا رہے تھے۔ ایک سہانی صبح کو پڑوسی نے یہ سنایا کہ اب میں ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہوں۔ میں نے آئینہ دیکھا اور اس خبر کی تصدیق کی۔ خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا۔ اب مجھے عشق کرنے کی فکر ہوئی کیونکہ جوان ہوتے ہی سب سے بڑا فرض محبت

کرنے کا عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے اس سلسلے میں مشق شروع کر دی۔ بات بات پر آہیں بھرنے لگا۔ کئی کئی روز کے بعد حجامت کرتا۔ بال بڑھ گئے۔ گریبان چاک، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، ہاتھوں سے طوطے اُڑ رہے ہیں اور مَیں خود فاختہ اُڑا رہا ہوں۔ اسی طرح سال گزر گیا لیکن دل کی آرزو پُوری نہ ہوئی۔ فقیر نامراد ہی رہا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ کوئی معقول محبوب ہی نہیں ملتا تھا۔ مَیں نے عشق و محبت کی خونچکاں داستانیں پڑھ پڑھ کر ایک فرضی محبوب کی تصویر بنا رکھی تھی۔ یعنی قد سرو جلیبا۔ گردن صراحی دار اور کئی فٹ لمبی۔ ہونٹ قطعاً غائب۔ اور اگر اتفاق سے ہوں تو ان پر خون لگا ہُوا۔ ناک تلوار کی دھار کی طرح تیز اور ستواں بھنویں کمان کی طرح۔ آنکھیں ایسی جن سے دھما دھم بجلیاں گریں، شعلے لپکیں۔ پلکیں ایسی نوکدار کہ نزدیک آؤ تو چبھ ہی جائیں اور خون نکل آئے۔ ایک بہت بڑے امیر کی لڑکی۔ علمِ موسیقی میں ماہر۔ بہترین شہسوار۔ شطرنج اور گنجفے میں طاق۔ نہایت عالی دماغ اور حاضر جواب۔ ویسے گنجفہ پتہ نہیں کیا ہوتا ہے۔

لیکن مَیں نے جہاں بھی کوشش کی مایوس رہا۔ جس میں مشکل سے ایک آدھ خوبی ملتی تھی، بقیہ آٹھ دس خوبیاں عنقا تھیں۔ مَیں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے فرضی محبوب پر بدستور عاشق رہا۔ اتنے میں میرا سالانہ امتحان ہُوا اور سارا عشق یک لخت ختم ہو گیا۔ امتحان کے دنوں میں کچھ ایسی وحشت

سوار ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ میں بالکل بھول گیا کہ مَیں کس قسم کی شبیہہ پہ عاشق تھا۔

"قطع کلام معاف،" پہلا درویش بولا۔ "مجھے ایک شعر یاد آگیا جو میں نے امتحان کے دنوں میں کہا تھا — عرض کیا ہے کہ۔

عشق کچھ پڑ گیا ہے ٹھنڈا سا

آج کل امتحان ہے پیارے"

سب نے اس شعر کی تعریف کی۔ اتنے میں ایک اور درویش بولا۔

"اسی وزن پر مَیں نے بھی ایک شعر کہا تھا اور یہ شعر اپنے محبوب کے ابّا جان کو لکھ کر بھیجا تھا —

اس کی شادی تو کیوں نہیں کرتا

تیری لڑکی جوان ہے پیارے"

"اور — میرا دل بے ایمان ہے پیارے" — ایک درویش نے لقمہ دیا۔ خوب شور مچا۔ تعریفیں ہوئیں۔

ایک طرف سے آواز آئی — "اور مَیں نے اپنے محبوب کو یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا —

تیرے سب خاندان پر عاشق

میرا سب خاندان ہے پیارے"

اس پہ ایک اور درویش کہنے لگا" اور میں نے محبوب پر ایک قصیدہ سُنایا تھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

آنکھ تیری ہے آنکھ ناک ہے ناک
اور ترا کان' کان ہے پیارے"

پہلے درویش نے چوتھے درویش کی چھوٹی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تیرے عارض پہ اور یہ سبزہ
گویا ٹینس کا لان ہے پیارے

— اے دوستو میں نے اپنے محبوب کو بہت تلاش کیا۔ اخباروں میں اشتہار بھی دیئے۔ اس چھان بین نے میرے تحت الشعور کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ میرا لاشعور تو بالکل ناقص ہو گیا۔ میں بغیر بوڑھا ہوئے سٹھیا گیا طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آنے لگے۔

ایک مرتبہ رات گئے میں جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ دفعتہً محسوس ہوا کہ چاند میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو سچ مچ چاند میری طرف بھاگا آرہا تھا۔

جب چاند قریب آگیا تو میں نے دوڑنا چاہا۔ چاند نے زور سے کہا "خبردار! جو ایک قدم اور اٹھایا۔ جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے رہو"

"مزاج تو اچھے ہیں آپ کے، کیونکر آنا ہوا؟" میں خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔
" چپ چاپ کھڑے رہو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں تمہارا کیا لگتا ہوں؟ میرا تمہارا رشتہ کیا ہے۔ یہ انسان بھی عجیب وغریب مخلوق ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ لو بس خواہ مخواہ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔" چاند نے دھمکاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں ابھی مطلب سمجھائے دیتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم ساری ساری رات مجھے کیوں گھورتے رہتے ہو؟ مجھے دیکھ کر طرح طرح کے منہ کیوں بناتے ہو؟ روتے پیٹتے کیوں ہو؟ آہیں کیوں بھرتے ہو؟ —— کیا تم مجھ سے کسی قسم کی مدد کے طالب ہو؟"

"بات دراصل یہ ہے۔ دیکھیے نا میں کسی پر عاشق ہوں۔"

"خوب! میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن آخر کیوں ہو تم عاشق؟ کسی نے التجا کی تھی؟ ان عاشقوں نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ رات کو جب میں چپکے سے زمین کی طرف آتا ہوں تو جیسے تمام عاشق میرے منتظر ہوتے ہیں۔ بس ٹکٹکی باندھ کر گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ چیخ پکار مچتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بھلا کوئی ان شریف آدمیوں سے پوچھے کہ جس پر تم عاشق ہو اُس کے سامنے یہ تماشے کرو، مجھے خواہ مخواہ کیوں پریشان کرتے ہو؟"

میں معافی مانگنے لگا ـــــ

"تو وعدہ کرو کہ مجھے آئندہ کبھی نہ گھورو گے"۔

میں نے طوعاً و کرہاً وعدہ کر لیا۔

چاند چلا گیا۔ ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا ہوں گا کہ مجھے ایک پرندے نے آلیا۔ دیکھتا ہوں تو یہ بُلبل تھی۔ اس نے فوراً مجھے ٹھہرا لیا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے ہمیشہ بدنام کیوں کرتے رہتے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ـــــ!"

"آپ نے میرے اور گلاب کے پھول کے متعلق جو جو باتیں اُڑائی ہیں وہ مجھے اچھی طرح معلوم ہیں۔ میں بتائے دیتی ہوں کہ اگر آئندہ آپ نے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا"۔

بُلبل تو چلی گئی لیکن اور کئی جانوروں نے مجھے گھیر لیا۔ ہرن نے پہلے تو خوب دھمکایا، پھر دیدے مٹکا کر بولا "اور یہ آپ ہماری آنکھوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ اگر اچھی ہیں تو ہماری آنکھیں ہیں۔ اس سے آپ کا کیا واسطہ۔ آپ یہ کیا چشمِ آہو، چشمِ آہو چلّاتے رہتے ہیں؟ اور انسانی آنکھ سے میری آنکھ کا مقابلہ کرنا میری سراسر توہین ہے۔ آئندہ آپ خبردار رہیں۔ ورنہ میرے کھُر خاصے تیز ہیں اور میرے سر میں سینگ بھی اُگ رہے ہیں"۔

ہرن ابھی گیا ہی ہوگا کہ دو سانپ فوراً میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

انہوں نے زلف والی تشبیہہ کے متعلق بڑی بحث کی اور یہ ثابت کر دیا کہ میں غلطی پر ہوں۔ مجھے معافی مانگنی پڑی۔ سرو کے درخت نے بھی ڈانٹا۔ ناردل نے سخت لہجے میں کہا کہ آئندہ ہمیں گنا تو یاد رکھنا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ سامنے سے چیتا آ رہا ہے۔ سوچا کہ اب یہ اپنی کمر والی تشبیہہ کا بدلہ اتارے گا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ چیتے نے تعاقب کیا۔ میں خاردار جھاڑیوں میں اور ٹہنیوں سے الجھتا' نالوں اور ندیوں کو عبور کرتا چلا گیا۔ آخر میرا دم پھول گیا اور ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ کوئی چیتا ہے نہ جنگل۔ ایک لق ودق صحرا ہے جس میں آدم ہے نہ آدم زاد اور نہ آدم بُو۔ کئی ہفتے بھوکا پیاسا پھرتا رہا پھر ایک سبز پوش بزرگ ملے جنہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے کہ "بیٹا زندگی کا چکر" ایسا ہی ہے۔ جو کچھ آئے سہنی پڑتی ہے۔ کبھی خدا اچھے دن بھی دکھائے گا۔ تو اڈہ اعجاز خاں کے پڑوس والے کالج چلا جا۔ وہاں تین درویش تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انشاءاللہ تیرے دل کو قرار آ جائے گا۔"

"معاف کیجیے۔ کیا وہ بزرگ آپ کو گوجرانوالہ کے آس پاس ـــ!"

"جی ہاں وہ مجھے وہیں ملے تھے ـــ!"

"تعجب ہے!"

"تو بھائیو! یہ ہے میری کہانی۔ اب میں زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔

تمام مشغلے ختم ہو چکے ہیں۔ رات کو چاند کی طرف دیکھنے کی ہمت پڑتی ہے نہ تاروں کو گننے کی۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بقیہ درویشوں نے بمشکل اسے چُپ کرایا اور بھنگ کا ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

سیر تیسرے درویش کی

تیسرے درویش نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے ڈکار لی اور بولا۔

نہ کر چارہ کچھ اس سے حاصل نہیں ہے
مرا دل مرمّت کے قابل نہیں ہے

دوستو! میرا قصّہ اس قدر طویل ہے کہ اگر سنانا شروع کر دوں تو مہینے گزر جائیں اور قصہ ختم نہ ہو لیکن میں مختصر نویسی اور کم گوئی کا قائل ہوں میں ترقی پسند مختصر افسانہ نگار ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آپ کو جلد از جلد سب کچھ سمجھا دوں۔ مَیں بے حد دُبلا پتلا شخص ہوں، اس لیے موٹے آدمیوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ کیا جانے کیوں؟ ۔ جب مَیں کسی موٹے آدمی کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔

دوستو! میرا وطن مغرب میں ہے ــــ اور مَیں ایک بہت امیر خاندان کی چشم ولائٹین ہوں۔ اوہ ــــ معاف کیجیے۔ امیر خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ جوانی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کا ذکر یہاں کیا جا سکے۔ چالیس سال

کی عمر میں شادی طے ہوئی۔ پہلے تو مَیں نے انکار کیا کیونکہ اس قدر جلد شادی کی کیا ضرورت تھی۔ پھر سوچا کہ سماج خفا ہو جائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے تیاریاں شروع ہوئیں۔ سِول لسٹ دیکھ کر تمام بڑے بڑے افسروں کو مدعو کیا۔ میں نے دلہن کے لاثانی حسن کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ برات وہاں پہنچی اتفاق سے مَیں نے نکاح سے پہلے دلہن کو دیکھ لیا —— کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہوا اس وقت —— بس پوچھیے مت —— کسی نے میری آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلاخیں ٹھونس دیں۔ کسی نے مجھے کوہِ سلیمان سے نیچے پھینک دیا۔ کسی نے مجھے خلیجِ بنگال میں ڈبو دیا۔ جیسے کسی نے میرے سر پر زور سے ڈنڈا مارا۔ اُف خدایا! جو کچھ مَیں نے دیکھا وہ ہرگز بیان نہیں کر سکتا —— اب تک وہ نقشہ میرے سامنے ہے۔ میں اُسے عمر بھر نہیں بھول سکتا۔"

"کیا دیکھا آپ نے؟" ایک درویش بے صبری سے بولا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔ ایسی منحوس گھڑیاں زندگی میں بہت کم آتی ہیں۔ وہ منحوس ترین گھڑی میری زندگی سے اب تک چسپاں ہے۔ جس قدر میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں اتنی ہی وہ یاد آتی ہے ——!"

"خدا کے لیے جلد بتائیے آپ نے کیا دیکھا؟"

"اور انسانی فطرت بھی کیسی عجیب ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ دل سے نہیں بھلایا جا سکتا۔ اور انسانی دل جس پر انسان کو اتنا ناز ہے اس قدر

کمزور ہے کہ اس کا کوئی یقین نہیں۔ اب مثال کے طور پر اسی حادثے کو لے لیجیے جو مجھ سے پیش آیا تھا۔ میں اب تک اسے نہیں بھولا ـــ مجھے سب کچھ یاد ہے ـــ"

"آپ کو ہماری قسم، ترقی پسندی کی قسم آپ کو موٹے آدمیوں کی قسم! ہمیں یوں نہ تڑپائیے۔ جلد بتائیے آپ نے کیا دیکھا" ایک درویش بولا۔

"کیا خاک بتاؤں ـــ!"

"ہاں ہاں بتائیے ـــ شاباش!"

"میں نے دیکھا کہ دلہن کے لباس میں ایک ایسی خاتون بیٹھی ہیں جن کی صحت ضرورت سے زیادہ اچھی ہے۔ جو بے حد موٹی ہیں اور میں وہاں سے ایسا تابڑ توڑ بھاگا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ راستے میں مجھے گوجرانوالہ کے آس پاس وہی سبز پوش بزرگ ملے اور انہوں نے یہاں بھیج دیا۔ بس یہ ہے میری کہانی"

چوتھے درویش کی داستان

چوتھے درویش نے زور سے چھینک ماری اور بولا ـــ

"دوستو! مجھے اس وقت کوئی موزوں شعر یاد نہیں ورنہ اپنے قصے کے ساتھ ضرور سناتا۔ میرا قصہ دلچسپ بھی ہے، عبرت انگیز بھی اور نصیحت و فضیحت آموز بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا وطن شمال میں ہے جہاں الف لیلہ مڈل

کے کورس میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ میرے لڑکپن کا ذکر ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک نیلم پری رہتی تھی۔ ہر روز اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر عمرعیّار کی طلسماتی ٹوپی پہن نگاہوں سے غائب ہو جاتی اور میں دیکھتا رہ جاتا۔ لیکن یہ قصّہ کہیں آپ نے سُنا تو نہیں ہُوا۔؟"

"نہیں ہم نے نہیں سُنا" سب بولے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے یار! تم درویش ہو کر ہمارا یقین نہیں کر رہے"

"بھئی معاف کرنا' بات یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی قصّہ پہلے سن رکھا ہو اور آپ زبردستی مجھ سے دوبارہ سُن لیں تو آپ اسی طرح پشیمان ہوں گے جیسے شہنشاہ نوشیرواں ایک مکھّی کو مار کر پشیمان ہُوا تھا"

"وہ قصّہ کیا ہے؟ ہمیں سناؤ" درویش بولے۔

"کسی ملک میں کوئی بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔ اس کا نام تھا نوشیرواں۔ ایک روز ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں وہ ٹھنڈا شربت پی رہا تھا کہ ایک مکھّی اس کی ناک پر آبیٹھی۔ اس نے اُڑادی۔ وہ پھر وہیں آبیٹھی۔ بادشاہ نے پھر اڑادی' وہ کمبخت پھر وہیں آگئی۔ بادشاہ کو پہلے ہی سردی لگ رہی تھی اسے غصّہ آگیا۔ اس نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ مکھّی کو گرفتار کر لیں۔ چنانچہ مکھی کو گرفتار کر کے حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ مکھّی نے کہا: اے بادشاہ! اس وقت تو مجھ سے

وہی سلوک کر رہا ہے جو وزیرِ اعظم ماشاء اللہ صاحب نے ایک پہاڑی بکرے سے کیا تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے وہ قصّہ سنا۔ معاف کیجیے، کیا آپ نے وزیرِ اعظم اور پہاڑی بکرے کا قصّہ تو نہیں سُنا؟"

"نہیں سُنا — ہم نے نہیں سنا"، سب نے کہا۔

"مکھّی بولی — اے شہنشاہ! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وزیرِ اعظم ماشاء اللہ شکار کھیلنے گئے۔ وہ چھ مہینے تک جنگلوں کی خاک چھانتے رہے لیکن کچھ نہ ملا۔ آخر ایک روز انہوں نے ایک پہاڑی بکرا دیکھا جو بڑے مزے سے ندی کے کنارے بیٹھا انگور کھا رہا تھا۔ وزیرِ اعظم نے کہا — "اے بکرے! ادھر آؤ"۔ بکرے نے کمال رعونت سے جواب دیا "نہیں آتے"۔ غصّے کے مارے وزیرِ اعظم کا بُرا حال ہو گیا۔ چلّا کر بولے — "کیا کہا، نہیں آتے؟ بدنصیب بکرے! تجھے معلوم ہے میں کون ہوں؟" بکرا بیٹھا رہا اور مسکرا کر بولا —

"ہاں معلوم ہے، تم بادشاہ کے مقرّبِ خاص ہو اور تمہارا نام انشاء اللہ ہے۔"

"ہمارا نام ماشاء اللہ ہے۔ جاہل، گدھے، بدتمیز، تجھے کس نے بکرا بنا دیا؟ تُو تو نرا اُلّو ہے۔ اور اس پر طُرّہ یہ کہ اکیلے اکیلے انگور کھا رہا ہے۔ میں وزیرِ اعظم ہوں اور ابھی تیری کھال اتروا سکتا ہوں"۔ وزیرِ اعظم غصّے سے کانپنے لگے۔

"یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا"، بکرے نے کہا۔

وزیرِ اعظم نے چشم زدن میں بکرے کو پکڑ لیا اور تلوار کھینچ کر چاہتے تھے

کہ سر تن سے جدا کر دیں۔ اتنے میں بکرا بولا "جناب آپ مجھے مار کر اسی طرح پچھتائیں گے جیسے پرنسپل سبز اختر اپنی دخترِ نیک اختر کا رشتہ پروفیسر نادان بیگ سے کر کے پچھتائے تھے"۔

"وہ قصّہ کیا ہے؟ وزیرِ اعظم نے بے چین ہو کر پوچھا۔ معاف کیجیے، کیا آپ میں سے کسی نے یہ قصّہ سنا ہے؟"

"نہیں سنا، خدا کی قسم نہیں سنا۔ بالکل نہیں سنا" درویش چلّا کر بولے۔

"— ہاں تو وزیرِ اعظم کے پوچھنے پر بکرا بولا" پرنسپل صاحب بالکل اسی طرح پچھتائے تھے جیسے میاں برخوردار صاحب اسمبلی کے لیے کھڑے ہو کر پچھتائے تھے"۔

"وہ قصّہ کیا ہے؟ وزیرِ اعظم نے چلّا کر پوچھا۔ بکرے نے قصّہ شروع کیا — وہ یوں ہے کہ جب میاں برخوردار صاحب اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے تو انہیں ووٹوں کی ضرورت بھی ہوئی۔ وہ گئے ایک زمیندار کے پاس اور کہا کہ مجھے ووٹ دو۔

زمیندار زور سے ہنسا اور بولا کہ تم نے ویسا سوال کیا ہے جیسا تبّت کے شہزادے نے ایک لومڑی سے کیا تھا۔ میاں برخوردار صاحب نے پوچھا کہ وہ کیا تھا؟

زمیندار نے کہا کہ وہ — معاف کیجیے، کیا آپ نے یہ قصّہ تو نہیں سنا؟"

"نہیں سُنا بھئی، نہیں سُنا آخر کس طرح تمھیں یقین دلائیں؟"
"لیکن دوستو! مجھے تو کچھ شبہ ہو چلا ہے کہ تم نے یہ قصّہ سُنا ہے۔"
"ارے بھئی نہیں سُنا! خدا کی قسم نہیں سُنا۔ عجیب درویش ہو تم بھی۔"
"۔ تو زمیندار بولا کہ تبّت کے شہزادے نے لومڑی سے پوچھا کہ آج تاریخ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا۔" تُو مجھ سے بالکل اسی طرح پیش آ رہا ہے جس طرح رئیسِ اعظم گنبد رضا ایک مچھلی سے پیش آئے تھے۔ یہ قصّہ تو آپ نے ضرور ہی سُنا ہوگا۔"
"نہیں سُنا بابا! نہیں سُنا۔ ہم حلف اٹھانے کو تیار ہیں۔ تم یقین کیوں نہیں کرتے۔"
"۔ اور جو تم نے سُن رکھا ہو تو؟"
تھانیدار سے نہ رہا گیا۔ وہ سامنے آ گیا اور چلّا کر بولا۔
"ابے او! صاف صاف بتاتا ہے یا لگاؤں ہتھکڑی؟"
اس نے جیبوں پر ہاتھ مارا لیکن وہ ہتھکڑی گھر بھول آیا تھا۔
"ارے! یہ کون ہے؟" درویش چیخ کر بولے۔
"مجھے معاف فرمائیے!" تھانیدار شرمندہ ہو گیا۔ "مجھے غصّہ بہت جلد آ جاتا ہے۔"
مرا مزاج لڑکپن سے غصّیانہ تھا

"آپ ہیں کون؟"

"میں کون ہوں؟ آہ کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ یہاں کا تھانیدار ہوں۔ بالکل بیکار ہوں مصیبت میں گرفتار ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔"

"لیکن یہ تو بتائیے کہ آخر کس نے آپ کو ستایا ہے؟ کس نے یہ ستم ڈھایا ہے؟ اور کس کا خونِ ناحق رنگ لایا ہے؟"

—— اور تھانیدار نے سارا قصّہ سنا دیا۔

قصّہ سنا کر تھانیدار نے شرما کر کہا —"ذرا سی بھنگ تو عنایت فرمائیے۔"
اسے بھنگ دی گئی جسے پی کر وہ بولا —"میں نے آپ حضرات کی کہانیاں سُنیں۔ میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔" درویشوں نے یک زبان ہو کہا —"دراصل ہم خود نہیں جانتے۔"

"میرے خیال میں تو آپ میرے ساتھ تھانے چلیے۔ وہاں بات چیت کریں گے۔"

"معاف کیجیے قبلہ! یہ تھانے کی دعوت اپنے پاس ہی رکھیے۔" درویش بولے۔

اتنے میں ایک درویش تھانیدار سے مخاطب ہوا —"اچھا اب آپ یہ بتائیے کہ آپ اولاد کیوں چاہتے ہیں؟ — اور وہ بھی لڑکا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا کی آبادی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر بچے کچھ ایسی نایاب چیز تو ہیں نہیں۔ گلی کوچوں، سڑکوں، محلّوں میں دیکھیے۔ لاتعداد بچے دکھائی دیں گے۔ اتنے بچے کہ آپ

گنتے گنتے عاجز آجائیں گے۔ سمجھ لیجیے کہ ان کروڑوں بچّوں میں آپ کے بھی چند بچّے شامل ہیں۔" اور تھانیدار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ واقعی بچّوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اب کوئی لڑکا وڑکا نہیں چاہیے۔ اور میں آپ حضرات کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ کنوارے ہی رہیں۔ پہلی شادی میں مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔ اگرچہ دوسری شادی میں کوئی حرج نہیں۔ واقعی آج کی ملاقات ہم سب کے لیے بیحد مبارک ثابت ہوئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"ارے! چار بج گئے۔" ایک درویش نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تو پھر کیا حرج ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"حرج تو کوئی نہیں۔ بات یہ ہے کہ نو بجے سے ہمارا پرچہ شروع ہوگا اور ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دیر سو لیں۔ ویسے ہم پرچوں میں کچھ نہیں لکھا کرتے۔ لیکن امتحان کے کمرے میں جو تین گھنٹے زبردستی بیٹھنا پڑتا ہے اس کی بڑی مصیبت ہے۔ وہاں لوگ سونے نہیں دیتے۔"

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔ اگر پھر کبھی محفل جمے تو اس خاکسار کو ضرور یاد فرمائیے۔"

محفل برخاست ہوئی۔ سب کے سب شاداں و فرحاں بامراد و کامیاب لوٹے۔

جس طرح خدا نے ان کے دن پھیرے اسی طرح ہم سب کے بھی دن پھیرے۔ آمین!

اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قصہ چہار درویش خیریت سے ختم ہوا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

مکان کی تلاش میں

مکان کی تلاش — ایک اچھے اور دل پسند مکان کی تلاش — دُنیا کے مشکل ترین امور میں سے ہے۔ تلاش کرنے والے کا کیا کیا جی نہیں چاہتا مکان حسین ہو۔ جاذبِ نظر ہو۔ آس پاس کا ماحول رُوح پرور اور خوشگوار ہو۔ سینما بالکل نزدیک ہو۔ بازار بھی دُور نہ ہو۔ غرض بیچ میں مکان ہو تو چاروں طرف شہر کی تمام دلچسپیاں حلقہ بنائے ہوئے ہوں۔ مکان تلاش کرتے والے کو آپ سڑک پر جاتے دیکھیے۔ اس کا حلیہ، اس کی چال اس کے چہرے کا اظہار اس کی حرکات سب سے عیاں ہو گا کہ یہ بے چارہ مکان کی تلاش میں ہے۔ مکان تلاش کرنے والے کا حال کچھ کچھ عاشق سے ملتا ہے۔ آج سے سو دو سو سال پہلے کے عاشقوں سے نہیں بلکہ آج کل کے عاشقوں سے۔ یعنی کوئی چیز معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ بعض اوقات اچھا خاصا مکان مل جاتا ہے۔ پھر بھی دل ہیں

بار بار خیال آتا ہے کہ ذرا اور ہاتھ پاؤں مارو، شاید اس سے بہتر چیز مل جائے۔

کوئی پوچھے کہ بھلا مکان کی تلاش کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ اخبار سے پتا پڑھا۔ چھٹی کے دن سائیکل سنبھالی اور چل دیے۔ جہاں مکان کرائے کے لیے خالی ہے، لکھا دیکھا ٹھہر گئے۔ مکان کو اِدھر اُدھر سے دیکھ کر پانچ چھ منٹ میں پسند کر ڈالا۔ کرایہ طے کیا اور شام تک آ بسے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ مشکلات ان پر بخوبی عیاں ہوں گی جنہیں کبھی اس قسم کا تلخ تجربہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم وہ لوگ ہیں جن کی قیمتی عمر کا زیادہ حصّہ مکان کی تلاش میں گزرتا ہے۔ اور ان سے دوسرے درجے پر ہیں طلبہ حضرات، جنہیں اوّل تو اپنی پسند کا مکان ملتا نہیں اور اگر کہیں مل بھی جائے تو فوراً سوال ہوتا ہے "بیاہا ہے ہو یا نہیں؟" اس قسم کے بے سمجھ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ایک وقت میں دو کام کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اور جو کسی چالاک سے طالب علم نے کہہ بھی دیا کہ ہاں ہم بیاہے ہیں، کر لو ہمارا کیا کر دگے؟ تو فرمائش ہوتی ہے کہ پہلے بیوی حاضر کرو۔ جہاں ایک بیاہا طالبعلم شریف الطبع، پرہیزگار، متقی، خدا سے ڈرنے والا اور شرافت کا پُتلا گردانا جاتا ہے۔ وہاں ایک بدقسمت کنوارے کو آوارہ گرد، بدتمیز، مشکوک چال چلن والا اور خطرناک سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اکثر معاملہ بالکل الٹا ہوتا ہے۔

ہمارے امتحان نزدیک تھے اور ہوسٹل کی فضا کچھ کچھ خراب ہونے لگی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ امتحان صرف ہماری جماعت کے تھے۔ باقی حضرات کے یا تو ہو چکے تھے یا ایک دو ماہ کے بعد تھے۔

پڑھنے کی بہتیری کوشش کی گئی۔ کمرے کو باہر سے تالا لگوا دیا جاتا چابی نوکر کے حوالے کر دی جاتی اور اسے خوب تاکید کی جاتی کہ خبردار جو تُو نے شام سے پہلے کمرہ کھولا۔ مگر ذرا سی دیر میں کامن روم سے پنگ پانگ کی ٹپ ٹپ سنائی دیتی۔ کبھی برج اور شطرنج والوں کا شور، دو دو منٹ کے بعد فلک شگاف قہقہے ــــــ ساتھ ہی ریڈیو سے ٹھمریاں اور قوالیاں، پڑوس کے لڑکوں کی نغمہ سرائیاں، کوئی ستار بجا رہا ہے کوئی وائلن۔ پڑھا لکھا سب برابر ہو جاتا۔ شام ہوتی تو فٹ بال کی دھما دھم اور ٹینس لان سے گیند کے بلے پر پڑنے کی پیاری آواز۔ لوگ تالاب سے بھیگے بھیگے واپس آ رہے ہیں۔ بہت سے حضرات بن سنور کر سیر کرنے جا رہے ہیں۔ غرض یہ کہ جی بڑے زوروں سے للچاتا۔ دماغ بغاوت کر دیتا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد یک لخت جو ہوش آتا تو اپنے آپ کو یا تو کسی سینما ہال میں پاتے یا کسی سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہوتے جو ہوسٹل سے کم از کم دو تین میل دور ہوتی۔ رات بھر اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتے اور قسمیں کھاتے کہ اگر کل پورے بیس گھنٹے لگاتار نہ پڑھا تو نام بدل لیں گے۔ آخر پاس بھی تو ہونا ہے اور قوتِ ارادی بھی تو کوئی چیز ہے۔

مگر دوسرا روز بھی اسی طرح گزر جاتا۔ روز کیا ہفتے یونہی گزر رہے تھے اور دن بھر کو کوئی پچاسوں لڑکے ملنے آتے ـــــ

"ہیلو !" ـــــ اور "اخاہ آئیے" کے بعد تقریر سننی پڑتی۔

"اررر بھئی! یہ وقت بھی کہیں پڑھنے کا ہے۔ توبہ توبہ! تم لوگ بھی زندگی سے بیزار ہو چکے ہو۔ ایسا بھی کیا کہ آدمی بالکل دھونی رما کر بیٹھ جائے۔ ایمان سے اگر میں اس طرح دو روز بھی پڑھ لوں تو ایک مہینے کے لیے لیٹ جاؤں۔ کونسی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ امتحان ہی تو ہے۔ جب دل چاہا پاس کر لیں گے۔ یہ کیا کہ اپنا ستیاناس ہی کر ڈالا۔ ارے میاں ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

دعا مانگ رہے ہیں کہ یہ کسی طرح یہاں سے ٹلے۔ لیکچر پھر شروع ہوتا ہے۔

"کل ہمارا کرکٹ میچ تھا۔ تم نہ تھے مزہ نہیں آیا۔ ویسے ہم لوگ جیت تو پھر بھی گئے۔ وہ جو ہے نا اپنا چھوٹا سا لڑکا ـــ کیا نام ہے اس کا؟ بھئی بھول گئے تم بھی۔ وہ کل غضب کا کھیلا۔ ان کا ایک بولر تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی سات فٹ کا ہوگا۔ پورا گینڈے کا گینڈا تھا۔ جب گیند پھینکتا تھا تو زمین ہلتی تھی۔ اور سٹارٹ بھی لینا ہوگا فرلانگ بھر کا۔ اس کے سامنے اپنا کوئی لڑکا بھی نہیں جما۔ مگر وہی چھوٹا سا لڑکا۔ میں اس کا نام پھر بھول گیا۔ وہ کچھ قلابازی سی کھا کر یوں بلا گھماتا تھا کہ پورا چوکا پڑتا تھا۔ وہ شاندار ہٹیں لگائی

ہیں کہ بیس منٹوں میں ساٹھ سکور کر گیا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اچھا کھیلتے! ایک بات مانو۔ تم اتنا آہستہ مت کھیلا کرو۔ دیکھنے والوں کو ذرّہ بھر مزہ نہیں آتا۔ اور ہاں بھئی! ایک بات دریافت کرنی تھی تم سے۔ امتحان کے بعد تمہارا پروگرام کیا ہے؟ میں پہاڑوں کی نسبت میدانوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ پہاڑوں پر ہوتا ہی کیا ہے۔ بس پہاڑ ہی پہاڑ ہوتے ہیں۔ نہ کوئی نئی چیز نہ تفریح ــــ رات کو پہاڑوں پر اُلّو بولتے ہیں ــــ لاحول ولا قوۃ۔"

جی میں آتا ہے کہ کہہ دیں "او نابکار انسان! میدانوں کو چھوڑ کر خواہ انڈیمان چلا جانا۔ مگر فی الحال تو یہاں سے دفع ہو جا" اگر پندرہ بیس منٹ تک یہ صاحب نہ ٹلیں تو پھر نگاہیں کتابوں، کیلنڈر اور دروازے کی طرف دوڑنے لگتی ہیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی نہ سمجھیں تو پھر دبی زبان میں امتحان کا ذکر کرنا پڑتا ہے کیونکہ انیسؔ ہی نے تو فرمایا ہے۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

وہ اچانک چونک پڑتے ہیں "ارے بھئی! توبہ توبہ میں بھی کتنا بدحواس ہوں۔ یہ بھول ہی گیا کہ تمہارا امتحان ہے۔ معاف کرنا مجھے سچ مچ خیال نہیں رہا۔ اچھّا امتحان کے بعد سہی!"

ایک تو خلاصی ہوئی۔ ذرا سی دیر میں ایک دوسرے صاحب آجاتے ہیں

اور دنیا کی فلم انڈسٹری کے ماضی، حال اور مستقبل پر ایک بسیط لیکچر دیتے ہیں۔ اور مس اندو بالا سے معاملہ رانلڈ کالمین اور ہیڈی لیمار پر ختم ہوتا ہے۔ فلموں کے بارے میں تنقید ہوتی ہے اور جادو کا ڈنڈا، فولادی مکا، ظالم گھسیارا سے کوئیں کر کیچینا، اور بن تحرتک —— سب پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پھر امریکی اور انگلش فلموں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ آخر میں سودیشی فلموں پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ تیسرے صاحب آتے ہیں جو عشق کے بارے میں اپنی تازہ ترین تحقیقات، مشہور عشاق کی سوانح عمریاں، عشق کرنے کے طریقے، فوائد اور نقصانات —— سب کچھ ہی تو بتا دیتے ہیں۔ پھر ایک اور حضرت آتے ہیں جو دنیا بھر کے پالیٹکس پر ایک جنرل سا ریویو کر کے محض دو گھنٹوں میں دنیا کے بڑے مشاہیر کی سیاسی غلطیاں اور ان کے عیوب سب کچھ سمجھا دیتے ہیں۔

ایک صاحب محض کبڈی ہی کے بارے میں تقریر کیے جائیں گے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کبڈی بھی کوئی کھیل ہے؟ مگر کبڈی کی تاریخ، بڑے بڑے کھلاڑی، کبڈی میں دلچسپی لینے والے بڑے بڑے آدمی، راجے اور مہاراجے، غرض سب کچھ بتا کر چھوڑیں گے۔ کوئی صاحب آئیں گے تو مکا بازی پر دھواں دھار تقریر کریں گے۔ حالانکہ ان کا حلیہ ایسا ہوگا کہ مکا تو کیا اگر ایک ہلکا سا چانٹا بھی مار دیا جائے تو ناک آؤٹ ہو جائیں۔ ادھر خواہ مخواہ ہاں میں ہاں ملانی پڑے گی۔ مسکرا کر اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا پڑے گا۔ سگرٹوں کے ڈبے

خالی ہو جائیں۔ نوکر چائے لاتا لاتا تھک جائے۔ مگر دبی زبان سے ذکر تک نہ کرو، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے۔ کوئی آتا ہے تو یونہی ٹائم پیس کو چابی دینے لگتا ہے۔ کوئی صاحب ملتان کی ہلکی پھلکی صراحی کو اس طرح پکڑیں گے کہ ذرا سی دیر میں ایک ہاتھ میں صراحی کی گردن ہو گی اور دوسرے ہاتھ میں بقیہ صراحی۔۔ ایک قہقہے پر معاملہ ختم۔

کوئی کتابیں الٹ ڈالے گا کہ کہیں کوئی ناول یا غزلوں کی کتاب تو نہیں رکھی۔ کوئی البم ہی دیکھنے لگے گا۔ ذرا نظر چوکی اور ایک آدھ تصویر غائب۔ کوئی صاحب ٹینس کا بلّا ادھار لے جائیں گے۔ اور تو اور بعض اوقات قمیض ٹائیاں تک مہینا مہینا لوگوں کے ہاں مہمان رہتی ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ہوسٹل کی زندگی بہترین زندگی ہے۔

بڑے غور و خوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ میں اور باقر صاحب دونوں ایک مکان کرائے پر لیں۔ ایک چمکیلی صبح کو ہم دونوں نے چائے پیتے ہوئے پروگرام بنایا۔ کیلنڈر میں دیکھا تو دن سنیچر کا تھا۔ چونکہ سنیچر منحوس سمجھا جاتا ہے اس لیے پروگرام یہ بنا کہ اتوار کو علی الصبح اس مہم پر روانہ ہوں گے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے اخباروں کی مدد سے اور اِدھر اُدھر

پوچھ کر خالی مکانوں کی فہرست پہلے ہی بنا لی تھی۔ سب سے پہلے ہم ایک ڈیری فارم پہنچے۔ وہاں ایک مکان خالی تھا۔ دروازے پر منشی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس سے مکان کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے جو ڈیری کے فوائد پر لیکچر دینا شروع کیا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ دودھ، مکھن، بالائی اور پنیر — ایک ایک چیز گنوا دی۔ شہر میں نقلی چیزیں ملتی ہیں۔ ان سے فلاں فلاں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم تنگ آکر بولے "پہلے مکان دکھا دو۔ پھر باتیں کریں گے۔" خیر اندر گئے۔ دیکھا کہ ایک بڑا کمرہ ہے جس میں اگر فٹ بال نہیں تو کم از کم ٹینس تو ضرور کھیل سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ دو ذرا ذرا سے کمرے جیسے کھلاڑیوں کے لیے بنوائے گئے ہوں کہ وہ سستا لیں یا کپڑے بدل لیں۔ وہ بولا۔ "اوپر چلیے۔" ہم نے سوچا کہ شاید اوپر کچھ مطلب کے کمرے ہوں گے۔ دیکھا تو وہی لمبا چوڑا سا کمرہ اور دو ننھے منّے کمرے۔ ہم ناامیّد ہو گئے۔

"نہیں صاحب ابھی ایک منزل اور بھی ہے۔" اُمیّد پھر بندھ گئی۔ اوپر جا کر دیکھتے ہیں کہ بعینہٖ وہی نقشہ۔ الٹے پاؤں لوٹے۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔ دوسرا مکان کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ دیکھا کہ دروازے پر ایک خطرناک قسم کے مولوی صاحب حقّہ پی رہے ہیں۔ ہمیں غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھا۔

" مکان چاہیے آپ کو؟" وہ کڑکے۔

"جی ہاں"

انہوں نے تین چار لمبے لمبے کش لگائے اور داڑھی سے کھیلتے ہوئے بولے ــــــ

" تو گویا سچ مچ آپ کو مکان درکار ہے" جیسے ہم اُن سے مذاق کر رہے تھے۔

" تو آپ کو ذرا تکلیف ہوگی۔ اس مکان کی چابی ہوگی منشی قلندر بخش کے پاس جو رہتے ہیں چنگڑ محلے میں۔ مگر ٹھہریے خوب یاد آیا۔ اب انہوں نے کباڑی بازار میں سکونت شروع کردی ہے۔ بڑے بھلے مانس ہیں۔ کیا کہوں، یہ عمر ہوگئی مگر ایسا جوان دیکھنے میں نہیں آیا (دونوں بازو پھیلا کر) یہ سینہ تھا ــــ اور (دونوں کہنیاں نکال کر) یہ چہرہ تھا۔ بالکل شیر جیسا۔ خدا کی شان، اب وہی قلندر بخش ہیں کہ منہ پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ پھر بھی کیا مجال جو آن بان میں فرق آجائے"

باقر صاحب بے چین ہو رہے تھے ــــ" صاحب اگر بُرا نہ مانیں تو ذرا چابیاں ــــ!"

" ہاں تو چابیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ چابیاں تو ان کے بھتیجے ابجاد علی کے پاس ہوں گی کیونکہ ان بیچاروں کا اپنا تو کوئی لڑکا تھا نہیں۔ بس اپنے

مرحوم بھائی کی نشانی کو دیکھ کر دل ٹھنڈا کر لیا کرتے تھے! — مگر مجھے خطرہ ہے کہ کہیں چابی اُن کا بھانجا قدرت اللہ نہ لے گیا ہو۔ کیونکہ پرسوں افواہ اڑی تھی کہ وہ ڈیرہ غازی خاں سے واپس آ رہا ہے۔ وہ قلعہ گوجر سنگھ کے پچھم والے حصّے میں رہتا ہے۔ ایک بڑی سی نالی ہے اس کے پار ایک بجلی کا کھمبا ہے۔ مَیں اچھی طرح نہیں کہہ سکتا کہ وہ وہاں رہتا ہے یا نہیں۔ بہر حال مکان اُن کا وہی ہے —"

"مگر ہم اتنی دُور نہیں جا سکتے۔"

"آپ چابی کا کریں گے کیا؟ لائیے مَیں آپ کو نقشہ سمجھائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر لگے ایک تنکے سے زمین پر نقشہ سمجھانے۔ "یہ غسل خانہ ہے — اور یہ ہے باورچی خانہ۔ ارر رمیں اُلٹا کہہ گیا۔ غسل خانہ یہ ہے اور وہ ہے زینہ۔ یہاں ایک کمرہ ہے! توبہ توبہ مَیں بھی کیا ہوں۔ یہاں تو ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے اور زینہ ہے وہاں۔" (مکان کی حد سے باہر بتاتے ہوئے کہا)۔

"گویا زینہ مکان کے باہر پڑوس میں کہیں واقع ہُوا ہے؟" باقر صاحب نے پوچھا۔

"جی نہیں، میرا مطلب ہے کہ زینہ اندر کی طرف ہے۔"

ہم دونوں اٹھ کر چل دیے۔

"اجی ٹھہریے — ذرا سنیئے تو سہی! اس مرتبہ ٹھیک بتاؤں گا۔ اب

سمجھ میں آگیا نقشہ" وہ بلاتے ہی رہے۔

اب مکان نمبر ۳ کی تلاش شروع ہوئی۔ خوش قسمتی سے یہ مکان کالج کے بالکل نزدیک تھا۔ ویسے مکان تھا بھی اچھا خاصا۔ ہمیں دور ہی سے پسند آگیا۔ معلوم ہوا کہ مکان کے دو حصّے ہیں۔ ایک میں مالک مکان رہتے ہیں اور دوسرا خالی ہے۔ وہ صاحب عجیب اینچی سے تھے۔ باقر صاحب نے آہستہ سے بتایا۔

"بھئی! مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں۔ اس کی حرکات عجیب سی ہیں"۔

ہم نے کہا ـــ "السّلام علیکم!"

بولے ـــ "وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ" (ایک ایک لفظ میں نون غنّہ بسا ہوا تھا۔ بعد میں جو گفتگو ہوئی اس میں بھی نون غنہ بدستور رہا)

"کیسے تشریف آوری ہوئی؟"

"آپ کا مکان ـــ!" باقر صاحب بولے۔

"اجی! بس کیا نام، خدا تمہارا بھلا کرے۔ سمجھو کہ بڑے خوش نصیب ہو، جبھی تو کھٹ سے ایسا مکان مل گیا۔ ورنہ کیا نام ـــ جناب بڑے بڑے آدمی مہینوں حیران و پریشان گلی کوچوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جناب مکان

نہیں ملتا — پھر یہ محلّہ، بس خدا تمہیں خوش رکھے، سب محلّوں کا سرتاج ہے۔ دیوان صاحب کا کٹڑا۔ اب اس کٹڑے پر کیا نام کہ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک بھتے میں نے کہا مولوی صاحب۔ وہ آئے دلّی میں کپڑا خریدنے۔ اب تمہیں خدا خوش رکھے ہوگا کوئی شادی وادی کا معاملہ۔ اب قصّہ اس طرح چلتا ہے کہ انہوں نے کپڑا خریدا۔ کیا نام نیل کے کٹڑے سے اور واپس چلے گئے۔ اب صاحب کوئی دس سال کے بعد میں نے کہا انہیں پھر ضرورت ہوئی کپڑے کی۔ وہ پھر دلّی آئے۔ اور ایک تانگے والے سے کیا نام بولے۔ ہمیں نیل کے بھینسے لے چل — اب صاب خدا تمہارا بھلا کرے یوں تو دلّی میں ہزاروں بازار اور لاکھوں گلیاں ہیں اور یوں بھی کیا نام تانگے والے ہوتے ہیں بڑے ظالم — پر صاب تانگے والے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بولا — بڑے میاں یہ عمر ہوگئی اور ہنسی مزاخ کی عادت نہ گئی۔ اب تک بھلا نیل کا بھینسا بھی دلّی میں کسی نے سُنا ہے؟ اب کیا نام بڑے میاں بھی چٹاخ سے بولے۔ ۔ ۔

ابے! میں نے کہا کل کے لونڈے، چلاتا ہے ہمیں! ابھی دس سال گزرے ہم نے نیل کے کٹڑے سے کپڑا خریدا تھا اور اب خدا تمہارا بھلا کرے دس سال میں وہ کم بخت کٹڑا بھینسا بھی نہ بن گیا ہوگا۔ اب صاب جو مذاق —"

"جناب! اس مکان کا کرایہ — ؟"

"ارے صاحب! کیا نام اتنی جلدی کا ہے کی ہے جو مرضی آئے دے دینا' خدا تمہیں خوش رکھے۔ آپ کے آنے سے ذرا رونق ہو جائے گی۔ ذری میں نے کہا محفلیں گرم ہوا کریں گی۔ یہاں سارنگی اور طبلوں پر مہینوں گرد جمی رہتی ہے آپ دونوں کیا نام ماشاء اللہ رنگیلے دکھائی دیتے ہیں۔ بس جناب مزہ آجائے گا۔ اور خدا تمہارا بھلا کرے' جب تک کوئی سننے والا نہ ہو کیا نام گانے بجانے کا مزہ ہی کیا۔"

اب جو ہم وہاں سے بھاگے ہیں تو کوئی آدھ میل آکر دم لیا۔ گانے بجانے کی محفلیں — رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جس چیز سے ڈر کر ہوسٹل سے بھاگے تھے وہی سامنے آموجود ہوئی۔

واپس ہوسٹل آئے۔ باقر صاحب نے الماری سے ایک اشتہار نکالا۔ لکھا تھا۔ — ایک مکان بجلی اور پانی سے آراستہ و پیراستہ' باورچی خانے اور غسل خانے مزیّن' صاف ستھرا اور پاکیزہ۔ عقب خاندانی دواخانہ' نزد حویلی سیٹھ رام نرائن مرحوم و مغفور باشندہ دہلی' درونِ کباڑی بازار۔"

"پھر وہی کباڑی بازار؟"

مکان دیکھا۔ کچھ ایسا تھا جیسے امریکہ میں ہوتے ہیں۔ یعنی بے تحاشا اونچا۔ نیچے پونے دو کمرے' یعنی ایک اوسط کمرہ دوسرا اس سے نصف اور

تیسرا اس سے نصف۔ پھر سیڑھیاں شروع ہوئیں۔ جیسے قطب صاحب کی لاٹھ پر چڑھ رہے ہوں۔ چڑھتے گئے۔ اوپر جا کر ڈھائی کمرے ملے۔ مگر دراصل حساب کے مطابق وہاں صرف سوا کمرہ ہی تھا یعنی نچلے کمروں سے دو نصف بچے۔

ہمارے رہنما بولے۔ "یہ غسل خانہ ہے۔"

"اور نیچے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ کیا تھا؟"

"جناب وہ باورچی خانہ تھا۔"

"اور ساتھ یہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے ــــ؟"

"ایک سامان رکھنے کا گودام اور دوسرا سونے کا کمرہ۔"

"عجب تماشا ہے۔" باقر صاحب نے جھلّا کر کہا۔

"اجی ابھی اوپر بھی کچھ ہے۔"

"نہیں صاحب، بس ــــ"

"اجی آپ کو ہماری قسم، ذرا ملاحظہ تو فرمائیے۔" وہ صاحب بولے۔

پھر وہی بے شمار سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ اوپر جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے۔ ایک مرغیوں کا ڈربا ہے۔ ایک طرف کبوتروں کی چھتری ہے اور ایک کونے میں پرانا ڈھول پڑا ہے۔ ہمیں ہنسی آگئی۔ بھلا کوئی اس سے پوچھتا کہ چھت پر کبوتر تو بے شک رکھے جا سکتے ہیں مگر مرغیاں کون رکھتا ہوگا۔ پھر وہ ڈھول؟ سارے مکان کا نقشہ ہی فضول سا تھا۔ جیسے کسی اناڑی نے مکان بنایا ہو۔

جب ذرا پینک دُور ہوئی ایک آدھ کمرہ بنوا دیا۔ کوئی کہیں ہے کوئی کہیں۔
"اب اترنا بھی پڑے گا" ہم نے دل میں سوچا۔
نیچے اتر کر فہرست نکالی۔ نیا مکان دیکھا۔ کشادہ میدان میں ایک خوبصورت سا مکان چمک رہا تھا۔ میں نے باقر سے ہاتھ ملایا۔ آخر ہم نے منزل مار لی تھی۔ اب جو دروازے پر دیکھتے ہیں تو لکھا تھا "حسرت کدہ" طبیعت پر اداس سی پڑ گئی۔

"اس کا مطلب؟" باقر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔
"کسی شاعر کا مکان معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا۔
شاعر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوا وہ نچلے حصّے میں رہتے ہیں۔ اوپر کا حصّہ خالی تھا۔ شاعر صاحب بھی بس ایسے کہ ڈبیا میں بند کر کے رکھنے کے قابل۔ دُبلے پتلے، شترمرغ جیسے، ناک پر عینک چپاں، حلیہ ایسا کہ اگر سڑک پر جاتے ہوں تو بچّہ تک بتا دے کہ وہ جا رہا ہے شاعر۔ چل کس طرف رہے ہیں۔ منہ کہیں ہے اور قدم کہیں پڑتے ہیں۔

باتیں شروع ہوئیں --- انتہائی لطیف باتیں۔ بات بات میں شاعری۔
"جب رات کو ساری کائنات پر ایک عجیب سا نور طاری ہوتا ہے۔ جب بے قرار دل بے طرح تڑپ رہا ہوتا ہے۔ جب فضا بھیگی بھیگی سی ہوتی ہے۔ جب آسمان میں تارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں تو جو

لطف اوپر کے مکان میں آتا ہے وہ نیچے کے مکان میں کہاں۔ آہ اگر میرا بس چلے تو دنیا کے تمام مکان اوپر کے مکان بنا دوں"۔ (یہ فقرہ ہماری سمجھ میں نہ آیا)۔ ہم عجیب کشمکش میں پھنس گئے۔ ایک طرف تو ایسا خوبصورت مکان اور دوسری طرف یہ شاعر — !

وہ یک لخت چمک کر بولے۔ "صاحب آپ مجھے رومان پسند لگتے ہیں"

"کیا میں ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "یا یہ — ؟"

"جی ہاں۔ آپ! آپ کا حلیہ، آپ کے کپڑے، آپ کی حجامت اور آپ کے کپڑوں کی خوشبو، سب کے سب گواہی دے رہے ہیں۔"

میں اپنے اس نئے خطاب پر حیران تھا۔

شاعر صاحب فرمانے لگے۔ "جناب بندہ فطرتاً رومان پرست ہے، بلکہ حسن پرست۔ چنانچہ میری شادی — آہ میری شادی — یہ ایک لمبی داستان ہے جو کبھی آپ کو فرصت میں سناؤں گا۔ ایک خونچکاں داستانِ حسن و عشق ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے والہانہ محبت ہے۔"

اتفاق سے میری نگاہ سامنے کھڑکی پر پڑ گئی۔ شاعر صاحب کی بیوی جھانک رہی تھیں۔

"صبح کے دھندلکے میں جب معصوم چڑیا گیت گا رہی ہو گی تو ہم سڑکوں پر سیر کیا کریں گے۔ دوپہر کے وقت میں آپ کو اپنے کلام سے محظوظ کیا

کروں گا اور شام کو جب سورج اپنی زرد زرد کرنوں سے زمین کو الوداع کہہ رہا ہو گا ہم باغ میں سیر کرنے چلا کریں گے اور میں کلام سنایا کروں گا۔"
بڑی مصیبتوں سے ہم نے اس شاعر سے پیچھا چھڑایا۔

ہم ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک رنگین مکان پر نظریں جم گئیں جس پر لکھا تھا 'کرائے کے لیے خالی ہے'۔ مکان تھا بھی سڑک پر اور بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ چابیاں انارکلی میں کسی وکیل صاحب کے پاس ملیں گی۔ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے۔ اندر سے وکیل صاحب نکلے۔ ہم نے اپنا مطلب ظاہر کیا۔

"آپ میٹر کا کرایہ فوراً ادا کر دیں گے؟"

"جی ہاں" ہم بولے۔

"اور کل کرائے کا آدھا یعنی نصف کرایہ پیشگی جمع کرا دیں گے؟"

"بہت اچھا"

"آپ حلفیہ بیان کرتے ہیں کہ پڑوس میں کسی کو تکلیف تو نہیں پہنچائیں گے؟"

"نہیں پہنچائیں گے"

"آپ مکان کے اندر لگے ہوئے قوانین پر عمل کریں گے؟"

ہم نے سر ہلا دیے۔

"آپ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں کہ مکان سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھائیں گے؟"

ناجائز فائدہ! غالباً ان کا مقصد تانک جھانک سے تھا۔

"نہیں اٹھائیں گے صاحب!"

"اور آپ مکان چھوڑنے سے کم از کم ایک ماہ پہلے حاضر ہو کر اطلاع دیں گے؟"

"ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔"

"اب سیدھے کشمیری بازار جائیے۔ وہاں رام ناتھ حلوائی کی دکان پوچھ لیجیے۔ بالکل اس کے سامنے رام چرن عینک والے کی دکان ہے۔ چابی وہیں ملے گی۔"

ہم دونوں وہاں پہنچے۔ دکان پر لالہ صاحب نہیں تھے۔ ان کے لڑکے کے ساتھ ان کے گھر جانا پڑا جو ڈبی بازار میں تھا۔ ہمیں دیکھ کر لالہ جی نے احتجاج کیا۔

"صاحب میں مکان پر کسی قسم کی خرید و فروخت پسند نہیں کرتا۔ نہ معلوم کتنی دفعہ لوگوں سے کہا ہے کہ کم از کم مجھے گھر تو چین سے بیٹھنے دیا کریں عینکیں اور دکانوں سے بھی مل سکتی ہیں۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ وکیل صاحب کے مکان کی چابی چاہیے۔

"اخاہ! وکیل صاحب کا مکان! خوب لطیفہ ہے صاحب۔ یہ وکیل صاحب کا مکان کب سے ہوگیا۔ کل تو بستر بغل میں داب کر یہاں آیا تھا اور آج مالک بن کر گیا۔ جناب مکان میرا ہے۔"

"بہت اچھا آپ کا سہی! مگر چابی کہاں ہے؟"

"مجھے اچھی طرح معلوم نہیں، البتہ آپ چوبرجی جائیے۔ وہاں نمبر پندرہ میں چرن جی لال ٹھیکیدار سے چابی مل سکتی ہے۔"

کوئی مغرب کے وقت چوبرجی پہنچے۔ وہاں چرنجی لال سے ملے۔ انہیں مقصد بتایا۔ "کیسی چابی؟ کس کی چابی؟ صاحبان آپ کو بڑی غلط فہمی ہوئی۔ مجھے کسی چابی کا پتہ نہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ واپس انارکلی جائیے۔ چابی وکیل صاحب کے پاس ہی ہوگی۔"

پھر واپس وکیل صاحب کے پاس پہنچے۔ انہیں ساری داستان سنائی۔ وہ ہنس کر بولے "چابی دراصل لالہ رام چرن کے پاس ہی ہے۔ وہ آپ سے ویسے ہی مذاق کرتے ہوں گے۔"

—— یہ مذاق کی بھی ایک ہی رہی۔

"تو پھر آپ اپنا کوئی آدمی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔" باقر صاحب نے تجویز پیش کی۔

وکیل صاحب نے دو آدمی ہمارے ساتھ کر دیئے۔ اب چار آدمیوں

کا مختصر سا قافلہ سائیکلوں پر روانہ ہُوا۔ ہم میں سے ایک کے پاس بھی روشنی نہ تھی۔ طے ہوا کہ آگے پیچھے ہو کر چلیں اور اگر کہیں پولیس والا ہو تو اشارہ کر دیا جائے۔ غرض یہ کہ عجب بے ڈھنگے پن سے ہم روانہ ہوئے کبھی کوئی کہیں نکل گیا ہے۔ کبھی کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ بیسیوں مرتبہ کھوئے گئے اور پائے گئے۔ ان دونوں کی حرکات سے پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ چلبلے سے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ایسے کھوئے گئے کہ گھنٹے بھر کی تلاش کے بعد بھی نہ مل سکے۔ لالہ جی کے ہاں پہنچے' وہ وہاں نہیں تھے۔ پھر واپس انار کلی آئے۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ خیال آیا کہ شاید چوبرجی نہ چلے گئے ہوں۔ وہاں بھی چکر لگا آئے۔ ایک مرتبہ پھر لالہ جی اور وکیل صاحب کے گھروں کا طواف کیا۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ نہ چابی ملی نہ وہ دونوں۔ آخر تنگ آکر واپس آگئے۔

رات کو مشورہ کیا گیا کہ کل اینگلو انڈین اور صاحب لوگوں کی کالونی میں مکان تلاش کیا جائے۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رات بھر ہم کتنے دل شکستہ رہے۔

دوسرے روز صاحب لوگوں کے محلّے کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ بچے سے بوڑھے تک جسے دیکھو بالکل سیاہ تھا جیسے

کسی نے زبردستی دھواں لگا دیا ہو۔

"نی کڑے وکٹوریہ! ــ تم کا بریک فاسٹ ہو گیا کہ نہیں؟" برابر کے مکان سے آواز آئی۔

"ہو گیا بھین مارگرٹ! لسّی اور ساگ لنچ کے واسطے کافی رکھا ہے۔ اگر بریک فاسٹ لئی وانٹڈ ہو تو پریزنٹ کروں۔" جواب ملا۔ "تھینک یو وکٹوریہ!"

بحث شروع ہوئی۔ میں کالے آدمیوں کی طرفداری کر رہا تھا اور باقر صاحب ان کے دشمن تھے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف ایک مکان دیکھیں گے۔ اگر پسند آ گیا تو خیر! ورنہ فوراً واپس!

ہم ڈرتے ڈرتے سامنے کے مکان میں داخل ہوئے۔ وہاں برآمدے میں ایک کالا کلوٹا بچہ ایک پتلی سی چھڑی سے ایک موٹے ستون کو ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بھاری سی میم صاحبہ نکلیں اور انگریزی میں چلّا کر بولیں "ولیم! کتنی دفعہ تم سے کہا کہ اس ستون کو اس بری طرح نہ ٹھوکا کرو۔ کسی دن یہ سارے کا سارا مکان سر پر آ پڑے گا۔"

ہم نے مکان کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اشارے سے بتایا کہ وہ ہے۔ ہم نے شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکرائیں اور ان کے دانت اس طرح چمکے جیسے اندھیری گھٹا میں بجلی چمکتی ہے۔ اب جو مکان جا کر دیکھتے ہیں تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایک بالکل بیہودہ مکان جس میں غالباً دروازوں اور

دیواروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہوگا قبل از مسیح سے بھی پہلے کا۔ دیواروں پر طوفانِ نوح کے نشانات تھے۔ مکان سے ۱۸۵۷ کی بھی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اندر جا کر دیکھتے ہیں تو سب کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوا۔ باقر صاحب بولے "غلطی ہوئی ہوگی"۔

جیب سے اخبار نکال کر پڑھا وہی مکان تھا۔ واپس ہونے لگے۔ باقر صاحب نے کہا "چلو انگریزوں کی طرف بھی ایک مرتبہ قسمت آزمائی کرتے ہیں"۔

وہاں پہنچے۔ ایک انگریز سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔ اس نے زبان کو اچھی طرح توڑ مروڑ کر جواب دیا کہ ہاں وہ سامنے ہے۔ مکان دیکھا۔ نیچے ہوٹل تھا اور پڑوس میں سینما۔ ہوٹل کے سامنے بے شمار تانگے کھڑے تھے۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ چپراسی بولا "جناب ایسے مکان کہاں ملتے ہیں۔ ذرا کھڑکی میں آ بیٹھے اور سامنے رونق ہی رونق ہے۔ طبیعت گھبرائی تو فوراً کوٹ سنبھالا اور کھٹ سے سینما میں پہنچ گئے۔ کبھی جی چاہا تو جلدی سے نیچے ہوٹل میں آ بیٹھے۔ ناچ واچ میں کوئی حرج نہیں۔ کوئی چیز منگوانا ہو تو بس (چٹکی بجا کر) منٹوں میں آ جاتی ہے"۔

"اور کرایہ؟"

"دو سو روپے"۔

ہم واپس چلنے لگے کہ اتنے میں ایک صاحب جو سوٹ پہنے ہوئے تھے اندر تشریف لائے۔ اور بولے۔

"جناب آپ طالب علم معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے لیے رعایت کی جاسکتی ہے۔"

"کتنی؟"

"ہم ڈھائی روپے کم کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ!" — ہم پھر واپس ہوسٹل آرہے تھے۔ سوچنے لگے کہ بس ایک مرتبہ آخری حملہ کیا جائے۔ کیونکہ دو روز ضائع ہو گئے تھے اور امتحان میں کل بیس روز رہ گئے تھے۔

باقی سب جگہ دیکھ چکے تھے۔ اب صرف شہر کا گنجان حصہ باقی رہ گیا تھا۔ پھر چل کھڑے ہوئے۔ لوگوں سے پوچھتے جا رہے تھے کہ کسی نے سامنے اشارہ کرکے کہا "اوپر کی منزل خالی ہے۔" ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھڑکی میں سے ایک بچہ جھانکنے لگا۔ وہ چلا گیا۔ پھر ایک لڑکا آیا۔ اس کے بعد ایک لڑکی آئی۔ وہ بھی چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں ایک عورت آئی اور اس کے بعد ایک بُڑھیا۔ پھر کوئی نہ آیا۔

ہم نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"پتاجی گھر میں نہیں۔" آواز آئی۔

"ہمیں پتاجی سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم میں سے کوئی باہر نکلو۔"

"آپ کو کہیں دولت رام ٹھیکیدار نے تو نہیں بھیجا؟" اندر سے آواز آئی۔

باقر صاحب جلدی سے بولے۔ "ہاں بھیجا ہے۔"

کھٹ سے کھڑکی بند ہو گئی۔ قصہ ختم۔ بے شمار آوازیں ذینے پر بھی کوئی نہ بولا۔ آگے چلے۔ چھوٹی چھوٹی تاریک گلیاں اور دونوں طرف عظیم الشان مکان! ایک جگہ پتا چلا کہ نزدیک ہی ایک حویلی خالی پڑی ہے۔ وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ بندر کا تماشا ہو رہا تھا۔ دروازوں، چھتوں، منڈیروں، کھڑکیوں میں جہاں دیکھو عورتیں، مرد، بچے کھڑے تھے۔

بمشکل اس ہجوم میں سے گزرے۔ مکان دیکھا تو اچھا تھا۔ کرایہ پوچھا۔ "اڑتالیس روپے پانچ آنے چارپائی۔" معلوم ہوا کہ مالک مکان بنیے تھے۔

"آپ انہیں کب ساتھ لائیں گے؟" لالہ جی نے پوچھا۔

"ہم شام تک سامان وغیرہ لے آئیں گے۔" باقر صاحب بولے۔

"جی نہیں، آپ کی وہ کب آئیں گی؟"

"ہماری وہ — کیا مطلب ہے آپ کا؟"

آپ بیاہے ہیں نا؟ — دونوں صاحبان؟

"جی نہیں۔"

"تو پھر آپ تشریف لے جائیے۔ یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ یہاں سب کنبہ دار آدمی رہتے ہیں۔ امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

سوچا کہ اب کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ ہاں بیاہے ہیں۔ باقر صاحب نے قسم کھائی کہ اگر اس دفعہ بھی مکان نہ ملا تو واپس ہوسٹل چلے جائیں گے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک خالی مکان کا پتا چلا۔ مکان تو اچھا نکلا مگر اس کا حدود اربعہ عجیب تھا۔ پڑوس میں ایک بے ہودہ سا سینما تھا۔ پیچھے گدھے بندھے ہوئے تھے۔

"یہ شور تو نہ مچائیں گے؟" ہم نے پوچھا۔

ایک لالہ جی بولے۔ "اوّل تو یہ گدھے ہیں ہی شریف۔ میرا مطلب ہے سیدھے سادے ہیں۔ صرف صبح اور شام کو شور مچاتے ہیں۔ ذرا رونق ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ایک ہفتے تک عادی ہو جائیں گے۔ وہ دیکھیے پنڈال سامنے ہے۔ ہر تیسرے روز وہاں جلسہ ہوتا ہے۔ وہ رہی پنواڑی کی دکان۔ ساتھ ہی نائی بھی ہے۔ یہاں نیچے دہی بڑے والا بیٹھتا ہے۔" لالہ صاحب نے بے شمار خوبیاں گنوا دیں۔

کرایہ ساٹھ روپے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیسا شریف ہے یہ شخص اس نے شادی کے بارے میں پوچھا تک نہیں۔ باقر صاحب کو جوش آیا تو بول اٹھے۔

"اور جناب ہم بیاہے بھی ہیں۔"

"اوہو! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ مگر آپ دونوں کی شریمتیاں ہیں کہاں؟"

"جی میکے گئی ہوئی ہے۔ چند ماہ تک آ جائے گی۔" میں نے بتایا۔

"خوب! اور آپ کی؟"

"سرگباش ہو گئیں۔ پچھلے مہینے! ابھی تو بے گھر ہوا پھر رہا ہوں۔" بافر صاحب رنجیدہ ہو کر بولے۔

مجھے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔ ادھر لالہ جی کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اجی پرماتما کسی کو بیوی کی موت کا غم نہ دکھائے۔ بس کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے انسان کی۔ میں تو خود یہ دکھ جھیلے ہوئے ہوں۔ کوئی بچہ تو نہیں چھوڑا بیچاری نے؟"

"ایک بچی تھی۔ دو تین مہینے کے بعد پرلوک سدھار گئی۔"

"آہ آپ دُکھیا ہیں — آپ کون سے کالج میں پڑھتے ہیں؟"

ہم نے کالج کا نام بتا دیا — !

کالج کا نام بتانا تھا کہ کیا تو لالہ جی رونے کی کوشش کر رہے تھے اور کیا ایک دم چونک پڑے۔

"صاحبان، معاف کیجیے! مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کو مکان نہیں دے سکتا۔"

"آخر کیوں —؟" ہم حیران رہ گئے۔

"آپ کے کالج کا ایک لڑکا یہاں رہا کرتا تھا۔ وہ سامنے کے مکان سے

ایک استانی کو بھگا کر لے گیا۔ چار سال سے ان دونوں میں سے کسی کا پتا نہیں چلا — ہم نہیں چاہتے کہ محلّے میں کہیں دوبارہ اس قسم کی واردات ہو۔"
ہم نے اس نامعقول لڑکے کو کوس ڈالا۔

شام کا وقت تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو واپس جا رہے تھے۔ ہم دونوں زمین پر نظریں گاڑے ہوسٹل کی طرف واپس آ رہے تھے۔ باقر صاحب شاید غور کر رہے ہوں گے کہ کس کے جوتوں پر زیادہ گرد جمی ہے۔ دل میں جو کچھ تھا سو تھا ہی، بظاہر ہم دونوں مسکرا رہے تھے۔

"سراسر بے ہودگی ہے یہ مکان وغیرہ ڈھونڈنا!" باقر صاحب بولے۔

"بالکل —!" میں نے کہا۔

ہم دونوں ہنس پڑے۔

ویسے بھی سنتے ہیں کہ اگر صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہیے۔

شفیق الرحمٰن کی تصانیف

- کرنیں
- شگوفے
- لہریں
- مدوجزر
- پرواز
- حماقتیں
- پچھتاوے
- مزید حماقتیں
- انسانی تماشا (ترجمہ)
- دجلہ

قیمت : ۳۰ روپے

نظرثانی شدہ تیسرا ایڈیشن